آن لائن بین الاقوامی اردو ادبی رسالہ

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵ء

حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ

سہ ماہی

# حاشیہ

اورنگ آباد، مہاراشٹر (انڈیا)

مدیر

ڈاکٹر ہاجرہ بانو

# حاشیائی قوسِ قزح

## کوزۂ بحر (اداریہ)


| | | |
|---|---|---|
| اپنی بات | ڈاکٹر ہاجرہ بانو | 3 |


## بادنخلستان (مضامین،انشائیہ،تبصرہ)


| | | |
|---|---|---|
| جنگ آزادی میں مسلم خواتین | ڈاکٹر تبسم آراء | 4 |
| لمرک کی صنف اور اردو | ڈاکٹر عرفان پاشا | 7 |
| مولوی شرف الدین | محمد سعید الدین | 11 |
| ناول راجدیو کی امرائی پر | ڈاکٹر صادقہ نواب | 14 |
| دھنک کا نظریاتی مطالعہ | سلیم طالب | 19 |
| مجھے کتابوں سے بچاؤ | محمد اسد اللہ | 23 |
| پرویز شہر یار کے نظموں کا مجموعہ | رئیس کمار | 27 |
| کارنامہ منیر لاہوری........... | ڈاکٹر نیلوفر حفیظ | 30 |
| اخبار کے فوائد | ناظیمہ بیگم | 48 |


## صدف عناب (افسانے،کہانیاں،افسانچے)


| | | |
|---|---|---|
| بے وفا | راجہ یوسف | 50 |
| دہلیز | ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ | 53 |
| کرب سوچ کا | رئیس صدیقی | 54 |
| شمع ابھی باقی ہے | عابد حسین راتھر | 56 |
| اندھیروں میں چاند | عابد حسین راتھر | 59 |
| کاش...........! | جمیل ارشد خان | 61 |


## شہابِ ساقی (حمد،نعت،نظمیں،غزلیں)


| | | |
|---|---|---|
| حمد | قاسم الدین پسوال | 22 |
| نظم (عہد وفا) | سیدہ سعدیہ فتح | 29 |
| غزل | توفیق فاخری | 58 |
| نظم (بچوں کی حفاظت) | رفیق طاہر کاوچکی | 60 |
| آزاد نظم (اوڑی) | شاداں رفیق | 63 |
| نظم (بنت حوا میرا بس یہی...... | ڈاکٹر فرزانہ فرحت | 65 |
| غزل | ثمر خالد اعظمی | 66 |

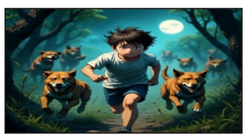

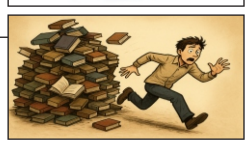

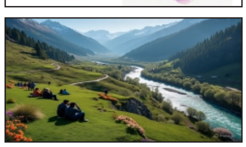

سہ ماہی
حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ
حاشیہ

مدیر:
ڈاکٹر ہاجرہ بانو

جلد نمبر : 07
شمارہ نمبر : 03
اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵
اورنگ آباد، مہاراشٹر، انڈیا

تزئین و ترتیب:
گلزار خالد اعظمی


بین الاقوامی سہ ماہی آن لائن اردو ادبی رسالہ حاشیہ کے لئے تخلیق کاروں سے گزارش ہے کہ اپنی تازہ تخلیق ان پیج فائل میں مع تصویر و پتہ موئل نمبر اس وہاٹس اپ نمبر پر سینڈ کریں۔
9860733049

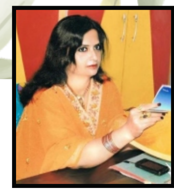

ڈاکٹر ہاجرہ بانو

# اپنی بات

اردو ادب ہمارے تہذیبی ورثے کا سب سے روشن چراغ ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جو ہماری سوچ، جذبات اور خوابوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اردو شاعری کی نازک خیالی ہو یا نثر کی سادہ مگر دلکش روانی، یہ سب ہمیں اپنی زبان کی مٹھاس اور اس کی فکری گہرائی کا احساس دلاتے ہیں۔

الفاظ کی دنیا ہمیشہ سے انسان کے دل کی گہرائیوں کا آئینہ رہی ہے۔ ادب وہ چراغ ہے جو معاشرے کے اندھیروں میں روشنی پھیلاتا ہے اور انسان کو اپنی اصل پہچان یاد دلاتا ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں مشینی زندگی نے انسان کے جذبات اور احساسات کو دبا دیا ہے۔ ایسے میں ادب ہی وہ سہارا ہے جو ہمیں ہمارے جذبات، خوابوں اور آرزوؤں سے جوڑے رکھتا ہے۔

ہمارا یہ رسالہ اسی مقصد کے تحت شائع کیا جا رہا ہے کہ قاری کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کیا جائے جہاں وہ ادب کے مختلف رنگوں سے لطف اندوز ہو سکے۔

اس شمارے میں کہانیاں ہیں جو آپ کو سوچنے پر مجبور کریں گی، نظمیں اور غزلیں ہیں جو دل کے تار چھیڑیں گی، مضامین ہیں جو نئی فکری راہیں کھولیں گے اور کچھ ایسے گوشے بھی ہیں جو محض مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ یہ رسالہ نہ صرف پڑھا جائے بلکہ محسوس کیا جائے، کیونکہ ادب کا اصل مقصد انسان کو انسان سے قریب کرنا ہے۔

آپ کی آراء اور تجاویز ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں، اس لیے ہمیں اپنے خیالات سے ضرور آگاہ کیجیے تاکہ ہم اس ادبی سفر کو مزید بہتر اور مفید بنا سکیں۔

آخر میں دعا ہے کہ یہ رسالہ آپ کے دل کو چھو جائے اور آپ کی روح کو تازگی عطا کرے۔

فقط والسلام

**ادار یہ**

# جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا کردار

جنگ آزادی میں خواتین کا کردار پس پردہ ہی رہا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ ملا کر لڑنے والی خواتین جنھوں نے جنگ وغدر کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہ کر ہندوستان کو آزادی دلائی ہے۔اس لئے آزادی ہمارے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔آزادی سے مراد Independent ملک وریاست کی ایک حالت جس میں اس کے باشندے اور آبادی یا اس کے حصے یا خود حکومت کا استعمال اور زیادہ تر علاقے عام طور پر خود مختاری ہو یا بیرونی رکاوٹوں کی عدم موجودگی ہو۔لفظ آزادی لاطینی لیبرٹاس سے آیا ہے۔اس اصطلاح کا معنی یہ ہیکہ جس میں کوئی شخص قید نہیں ہوتا۔یعنی دوسرے لوگوں کا تابع نہیں ہوتا۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی، اودھ کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا ملک کے طول وعرض میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔1857ء میں سارا ہندوستان کا چپہ چپہ ان کے لئے دوزخ بن گیا۔اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین نے اس انقلابی دور میں غیرت وبہادری، سرفروشی اور ایثار وقربانی کے دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔اور انھوں نے پرچم بنانے آزادی کی تحریک میں اپنے باپ، بھائی، بیٹے اور شوہر کی مدد کی بلکہ عمل جدوجہد میں حصہ لیا اور یہ بطور رضا کار مہم میں شامل ہوئیں۔ تحریک عدم تعاون ہو یا کسی بھی فنڈس کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام میں خواتین ہمیشہ پیش پیش رہی۔ان خواتین کی اکثریت کالج یا اسکول کے فارغ التحصیل تھیں جو 1930ء میں گاندھی جی اور کانگریس (Indian National Congress) کے ہمہ جہت مقاصد ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، دیہی ترقی، تعلیم بالغان، ہریجنوں کی فلاح و بہبود کے تعمیری منصوبے عوامی رابطہ منصوبہ Maff contact جیسے کاموں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہیں۔ وہ کھل کر عوامی جلسوں میں شریک ہوئیں۔ ولایتی کپڑوں اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دیا۔ان کی اکثریت قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔بحثیت مجموعی یہ سبھی پردہ نشین خواتین تھیں۔ اس کے باوجود ان کی سیاسی سرگرمیوں کا واحد مقصد متحدہ ہندوستان اور آزادی اور انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارہ ان کا دیرینہ

خواب تھا۔

مہاتما گاندھی نے Young India میں لکھا تھا کہ ''مسلمان خواتین کے تذکرے کے بغیر تحریک آزادی کی داستان ادھوری ہے''۔

تاریخ کے اوراق خاتون مجاہدین آزادی کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اُن بہادر خواتین میں ہیں۔ بیگم حضرت محل' آبادی بانو بیگم' منیرہ بیگم' بیگم آصف علی' اکبری بیگم' نشاط النساء بیگم' خدیجہ بیگم' صغرا خاتون' سلطانہ بیگم' ساجدہ بانو' رضیہ خاتون' آمنہ طیب جی' بیگم ثریا' بیگم ماجدہ بانو وغیرہ قابل ذکر ہیں اوران خواتین نے آزاد و غیر مذہبی و جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایا ں کردار ادا کیا ہیں۔

**بیگم حضرت محل:** بیگم حضرت محل اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کی دوسری بیوی تھیں نواب واجد علی شاہ نے انھیں بیگم کا خطاب دیا تھا وہ قائدانہ صلاحیتوں کی مالک تھی۔ جنگ آزادی کے سپاہیوں کو ایک سربراہ کی تلاش تھی جو ان کے حوصلے بلند کر سکے۔ بیگم حضرت محل اس مشکل گھڑی میں قیادت سنبھالی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے قیادت سنبھالتے ہی بھرتی کا اعلان کیا اور تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری کیا کہ '' ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا ہے۔ تمام امور سلطنت کو حضرت محل ایک مشاورتی کمیٹی کی رائے سے طئے کرتی' جس میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک تھے۔ غدر کے زمانہ میں ان کا قیام چولکی میں تھا۔ اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا''۔ بحوالہ عبدالحلیم شرر (گذشتہ لکھنؤ ص 134)

حضرت محل محاذ جنگ پر تلوار ہاتھ میں لئے اپنے پُر جوش الفاظ سے وہ عوام اور فوج کے دلوں میں قربانی' حب الوطنی اور آزادی کا جوش بھرتی اور دوران جنگ فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔

چنانچہ حضرت محل سپاہیوں کو حوصلے سے زیادہ انعامات دیتی' معرکہ عالم باغ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلہ میں رومال دوشالے اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا۔ اور کہا کہ فتح کے بعد بہت سارا روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی''۔ (بحوالہ قیصر التواریخ میں267)

بیگم حضرت محل انگریزوں کے لئے ایک ایسی بجلی ثابت ہوئیں۔ جو اس دور میں متوقع تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عوام کے سبھی طبقے ایسٹ انڈیا کمپنی East India Company کے اصولوں سے سخت پریشان تھے۔ کمپنی کا حلقہ تجارت جب بڑھا تو جو نظریات مذہب' عزت' دولت کے سلسلہ میں عام کئے گئے تو وہ عوام کے لئے نہ صرف نئے بلکہ قطعی نا قابل قبول تھے۔

وطن کو چھوڑ کے حضرت محل نے غربت میں
لہو سے اپنے جلایا چراغِ آزادی

**آبادی بانو بیگم:** آبادی بانو بیگم جسے گاندھی جی نے بی اماں کا لقب دیا تھا' ایک قدامت پسند مسلمان خاندان سے وابستہ ہونے کے باوجود ہندوستان کی جدو جہد آزادی میں مسلم خواتین میں سب سے زیادہ نمایاں کردار رہا ہے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوا۔ اپنی معاشی حالت کمزور ہونے کے باوجود 1917ء سے 1921ء تک قانون تحفظ ہند کے خلاف احتجاج کے لئے ہر ماہ 10 روپئے بطور عطیہ دیتی رہی۔ اور 30 دسمبر 1917ء کو کولکتہ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ولولہ انگیز تقریر کی' جس سے حاضرین کے دلوں میں تا دیر تک اس تقریر کا اثر قائم رہا۔

بالآخر تحریک آزادی میں نہایت خوش اسلوبی سے خدمات انجام دینے والی (علی برادران' محمد علی جوہر اور شوکت علی) کی والدہ آبادی بانو بیگم عام لوگوں میں 'بی اماں' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ تاریخ ساز شخصیت

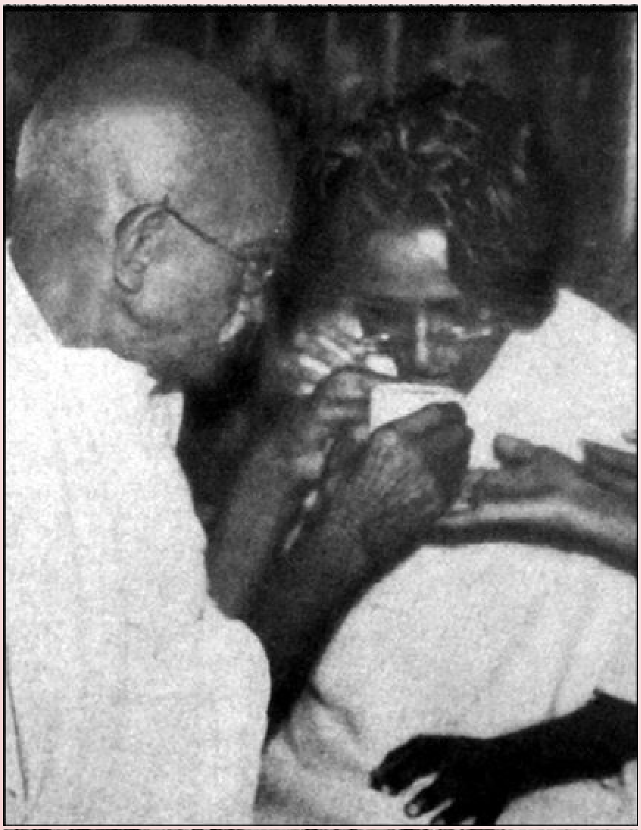

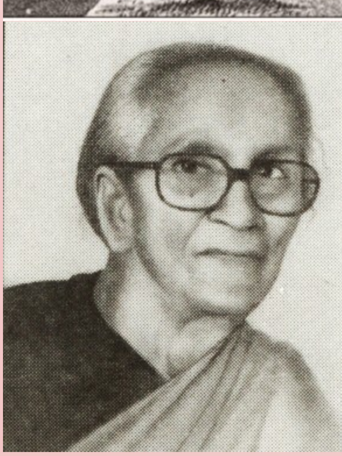

مولانا محمد علی، خود لکھتے ہے کہ ’’میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے، خداوند کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعہ پہنچایا ہے‘‘۔

**بیگم نشاط النساء موہانی:** 1901ء میں مشہور شاعر وانقلاب زندہ باد و جوشیلے نوجوان حضرت حسرت موہانی کی شادی نشاط النساء بیگم سے ہوئی۔ حضرت موہانی کی گرفتاری کے بعد سے نشاط بیگم کے سیاسی زندگی کا آغاز ہوا ہے اور انھوں نے اپنے شوہر کے سیاسی اور سماجی کاموں میں ان کا ساتھ دیا، اور ان کی گرفتاری کے بعد پبلک ریلیشن آفیسر Public Relation Officer کی خدمات انجام دینے کے علاوہ علی گڑھ میں سودیشی اسٹور بھی پوری لگن کے ساتھ سنبھالا۔ اور مقدمہ کی پیروی بھی کی۔ وہ مالی طور پر کمزور ہونے کے باوجود خوددار طبیعت کی مالک تھی۔

بحر حال آزادی کی اس جنگ میں مظفر نگر کے دوسو پچپن 255 خواتین کو انگریزوں نے گولیوں سے اُڑادیا، گیارہ خواتین کو پھانسی دی گئی۔ اصغری بیگم جو مجاہد آزادی قاضی عبدالرحیم کی والدہ تھیں ان کو برطانوی افواج کی مزاحمت میں زندہ جلادیا گیا۔ اسی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت کرتے کرتے کئی خواتین نے اپنے وطن پر قربان ہوگئی۔ جنگ آزادی میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ایسی دوسری مسلم خواتین رہی ہوگی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوچکی ہیں۔ 1937ء میں مجاز لکھنوی مرحوم نے ہندوستان کے نوجوان عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی۔

تیرے ماتھے پر یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

☆☆☆

**ڈاکٹر تبسم آراء**
Mob: 7780300889

# لمرک کی صنف اور اردو ادب میں اس کا ورود و ارتقا

ڈاکٹر عرفان پاشا
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور۔
Cell. No. 0321-4758717 & 0335-4758777

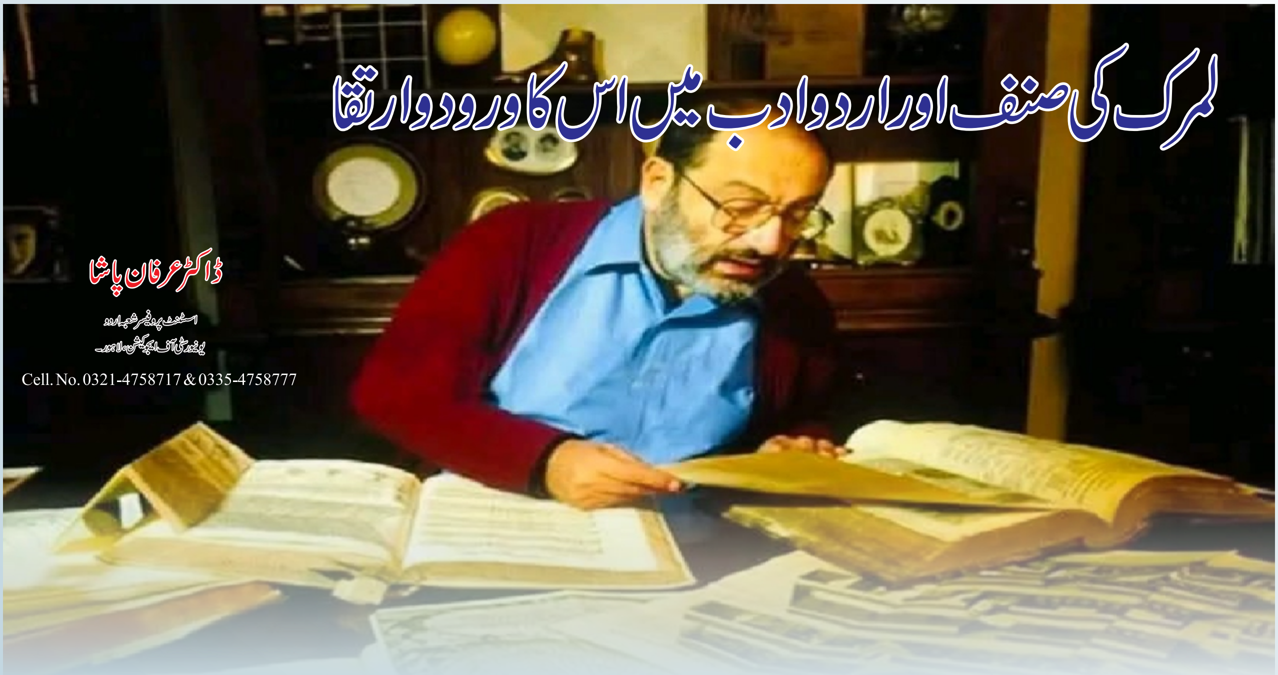

لمرک یا لیمرک (Limerick) انگریزی صنف سخن ہے جو مزاحیہ موضوعات کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اسی نام سے آئرلینڈ میں ایک کاؤنٹی اور شہر کا نام بھی ہے اس لیے ایک تاثر یہ ہے کہ اس صنف کا تعلق اسی علاقے سے ہوگا لیکن اس ضمن میں بلی کولنز کا ماننا ہے کہ اس صنف میں جو قدیم ترین نظمیں دستیاب ہیں ان کا تعلق انگلستان سے ہے اس لیے نام کی مشابہت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے دراصل یہ نام ایک انگریزی گیت کے مصرعے ''Won't You Come to Limerick?'' سے لیا گیا ہے جس کی بحر عین وہی ہے جو لمرک کے لیے مروج ہے۔ اس مصرعے میں لمرک سے مراد وہی آئرلینڈ کا شہر لمرک ہے۔ اس صنف کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہوا تاہم اس کو مقبولیت انیسویں صدی میں اس وقت ملی جب ایڈورڈ لیئر (Edward Lear) نے ۱۸۴۶ء میں اپنی ایک سو ستر لمرک نظموں پر مبنی کتاب ''اے بک آف نان سینس'' (A Book of Nonsense) شائع کی[۱]۔

یہ ایک پانچ مصرعی نظم ہے جس کا پہلا دوسرا اور پانچواں مصرع ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے اور یہ ایک ہی بحر میں لکھے جاتے ہیں جب کہ تیسرا اور چوتھا مصرع ذرا مختصر مگر آپس میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس میں قوافی کی ترتیب یوں ہوتی ہے (اا ب ب ا)۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان لمرک کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''انگریزی میں مروج ایک طرح کی ہلکی پھلکی اور عموماً مزاحیہ صنف سخن۔ عام طور پر پانچ مصرعوں پر مشتمل۔ پہلا، دوسرا اور پانچواں مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ یوں صرف دو قافیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں پہلا دوسرا اور پانچواں مصرعہ تین ارکان پر اور تیسرا اور چوتھا مصرعہ دو ارکان پر مبنی ہوتا ہے۔[۲]

عالم گیریت کے عمل کے زیر اثر جہاں دیگر مغربی ادبی اصناف کو اردو کے قالب میں ڈھال کر استعمال کیا گیا وہاں اردو کے بعض شاعروں نے لمرک کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ یہ الگ بات ہے کہ لمرک کی یہ صنف اردو دان طبقے میں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی اور نہ ہی اسے کوئی بڑا شاعر میسر آیا ہے جس کی وجہ سے ابھی تک اس صنف کی حیثیت تجرباتی ہی ہے۔ نذیر احمد شیخ کو اردو میں لمرک نگاری کے بانیوں میں تسلیم کیا جاتا ہے اور انھوں نے اس صنف میں تسلسل کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ نذیر احمد شیخ لمرک کی ہیئت اور اجزائے ترکیبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انگریزی ادب میں لمرک ایک مقبول طرز سخن ہے جو پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلے دوسرے اور پانچویں

مصرعے لمبے اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعے دانستہ چھوٹے اور ہم قافیہ لکھے جاتے ہیں۔قوافی عموماً مشکل و غیر مانوس قسم کیے اختیار کیے یا گھڑ لیے جاتے ہیں۔مکمل لمرک ایک پلاٹ رکھتی ہے جو مضحکہ پیدا کرتا ہے۔‘‘[۳]

نذیر احمد شیخ نے تسلسل کے ساتھ اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی نظمیں لمرک کے حقیقی مزاج سے قریب تر ہیں اور ان میں ویسے ہی مضامین پیش کیے گئے ہیں جیسا کہ انگریزی نظموں میں ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز مقامی ہے۔دور حاضر کے عشقیہ معاملات کے حوالے سے ان کی ایک لمرک نظم دیکھئے:

حسن کہتا تھا جناب عشق اب شادی کرو
عشق کہتا تھا کہ شادی کی مصیبت سے ڈرو
تنگ آ کر حسن بولا ہائے ہائے
کیا ضروری ہے کہ جس دم موت آئے
اپنے والد کی طرح تم بھی کنوارے ہی مرو[۴]

یا ایک لمرک بہ عنوان ’’کشیدگی‘‘ دیکھئے جس میں ہمارے سماجی رویوں میں عدم برداشت کو کس خوبصورتی سے طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

## کشیدگی

اک پڑوسی سگ پرست اور دوسرا گربہ نواز
سگ ہوا گربہ طلب گربہ ہوئی پنجہ نواز
منھ جو دونوں کا ملا رگڑا ہوا
دو گھروں میں رات بھر جھگڑا ہوا
اب پڑوسی ایک مسجد میں نہیں پڑھتے نماز[۵]

لمرک کا انداز مزاحی ہے اور ایڈورڈ لیئر نے اسے بے وقوفانہ شاعری یا نان سینس پوئٹری کہا تھا اس لیے اس میں مزاح پیدا کرنے کے لیے عجیب و غریب خیالات اور بے ڈھنگی باتیں کہنا بھی روا سمجھا جاتا ہے اسی لیے نذیر احمد شیخ نے بھی اس صن سخن کے مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ اول فول اور اول جلول خیالات کو بھی لمرک مین نظم بند کیا ہے۔ایک مثال دیکھئے:

## خربوزہ

ایک دریوزہ گر نے لے کر تھوڑا سا دریوزہ
ایک ٹکے کی مصری لی اور تین ٹکے کا کوزہ
پانی میں جب رکھ دی گیلی
کوزے نے سب مصری پی لی
جب تک اس دریوزہ گر نے کھایا اک خربوزہ[۶]

اسی طرح ذیل کی لمرک بھی ایسے ہی بے سروپا خیالات کی منظوم شکل ہے:

## غرقاب

سڑکوں پہ تھا ہر سو پانی پیدل مسٹر چشتی
ان کی شامت لائی قامت سہ بالا بالشتی
تانگے والا بولا آؤں
ٹیکسی والا بولا لاؤں
لیکن ان کی رٹ تھی کشتی کشتی کشتی[۷]

معاشرتے مسائل کسی بھی شاعر کی شاعری کا اہم جزو ہوتے ہیں۔مزاحیہ شاعر کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس کا کام ہی معاشرے کی خرابیوں کا پوسٹ مارٹم کرنا ہوتا ہے۔نذیر احمد شیخ نے بھی معاشرے کی کمزوریوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اور ان کا اپنے مخصوص انداز میں مضحکہ اڑایا ہے کہ ہم بظاہر ترقی کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں بدترین زوال کا شکار ہیں۔’’ترقی معکوس‘‘ کی صورت میں ان کا یہ احتجاج دیکھیں:

## ترقی معکوس

اب ہم سے شادمانی کچھ دور ہٹ رہی ہے
توقیر بڑھ رہی ہے تنخواہ گھٹ رہی ہے
جو آ پڑی ہے جھیلو
دن رات پھاگ کھیلو
کل ناک کٹ رہی تھی اب جیب کٹ رہی ہے[۸]

اسی طرح فیملی پلاننگ کے حوالے سے بھی ایک مزاحیہ لمرک دیکھیں:

**فیملی پلاننگ**

فرصت میں جنجوعن سے جنجوعہ
پوچھا کرتے بچوں کا مجموعہ
اک دن سن کر آٹھ
حضرت سمجھے ساٹھ
اس دن سے منکوحہ ہے ممنوعہ [۹]

نذیر احمد شیخ نے اردو کے مقامی خیالات اور بالخصوص روزمرہ اور محاورہ کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔بعض محاورات میں پہلے ہی مزاح کا رنگ موجود ہوتا ہے لیکن جب ان کو کسی خاص صورت حال میں پیش کیا جاتا ہے تو ان کا تاثر بھی بڑھ جاتا ہے اور مزاغ کی شگفتگی بھی مستزاد ہو جاتی ہے۔جیسے انھوں نے ''بھینس کے آگے بین بجانا'' کے محاورے کو لمرک میں یوں فٹ کیا ہے:

**دانائے راز**

جاتے تھے کل مزار کن الدین
پیچھے بھینسوں کے کھڑ کاتے ٹین
پوچھا حضرت یہ کیا رنگ
بولے اپنا اپنا ڈھنگ
ان کے آگے کون بجائے بین [۱۰]

نوید ظفر کیانی اس صنف کے شاعر بھی ہیں اور نقاد و محقق بھی۔ انھوں نے ان کی ایک اور لمرک بہ عنوان ''ارتقائے زبان'' ڈھونڈی ہے جس میں مزاح کا رنگ تیز ہو کر طنز کی حدود تک پہنچ گیا ہے۔اس لمرک میں پنجابی زبان کے الفاظ کو شامل کرنے کا بھی تجربہ کیا گیا ہے:

**ارتقائے زبان**

بس گئے پنجاب میں روئی کوروں کہنے لگے
دلبران لکھنواوئی کواوں کہنے لگے
آج کل رنگ زباں کچھ اور ہے
شوخی و حسن بیاں کچھ اور ہے
آپ کو تم، تم کو تو اور تو کو توں کہنے لگے [۱۱]

نوید ظفر کیانی بھی ان اردو شعرا میں ممتاز ہیں جو اس ہیئت میں مسلسل لکھ رہے ہیں جو ان کی ویب سائٹ پر نظر آتی رہتی ہیں۔انہوں نے بھی اپنے فکری نظام کی اساس معاشرے پر ہی رکھی ہے۔ جو معاشرے کی کجیوں اور کوتاہیوں کو بیان بھی کر دیتی ہے اور انداز ایسا لطیف ہے کی ان کی تلخی منہ کا ذائقہ کڑوا نہیں کرتی بلکہ مزاج میں بشاشت لے آتی ہے۔ان کی مشہور لمرک نظموں میں ''سالا'' میں، ''راز ارتقا''، ''بہرہ'' شامل ہیں۔''بہرہ'' میں ہمارے معاشرے میں سماعت سے محروم افراد کیسر شت کو موضوع بنایا گیا ہے:

**بہرہ**

سخن ناآشنا ہوتا ہے بہرہ
کہ اس لذت سے بے بہرہ ہے بہرہ
مگر مطلب کی باتیں
کبھی ان سے جو کر لیں
کہی وان کہی سنتا ہے بہرہ [۱۲]

اسی طرح نوید ظفر کیانی نے سیاسی موضوعات پر ہنگامی لمرک بھی لکھی ہیں۔ان میں اس المیے کو بیان کیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں سیاست دان ہر برائی، کرپشن اور لوٹ مار کر کے بھی مزے اڑاتے ہیں اور کمزور لوگ معمولی سے معمولی معاملات میں بھی چھوٹی موٹی غلطی پر بھی کڑی سے کڑی سزا پاتے ہیں۔یعنی اس ملک میں ٹاٹھ صرف سیاستدانوں کے ہی ہیں۔''نصیب اپنا اپنا'' نام کی یہ لمرک دیکھیے:

**نصیب اپنا اپنا**

ایسا بھی ہے کوئی گلی میں الو آف دی کاٹھ
چھیڑ کے جو لڑکی کو کھا بیٹھا ہے جوتے ساٹھ
لیکن اپنے دیس
میں ہے یہ بھی کیس
کوئی پناما لیکس میں آ کر بھی ہے ٹھاٹھوں ٹھاٹھ [۱۳]

ہمارے معاشرے میں لوگ جس طرح اپنے مطلب کی تاویلات

کرتے ہیں اور مذہبی معاملہ ہو یا سماجی اس کو کسی نہ کسی صورت اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اس سے کوئی بھی چیز اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں رہی۔نوید ظفر کیانی نے اپنے ایسے مشاہدات کو بھی لمرک نظموں کا روپ دیا ہے جس سے ان کی طرف لطیف اشارہ بھی ہو جاتا ہے اور طبائع بھی مکدر نہیں ہوتیں۔ مذہب، معاشرت، حتی کی ڈاکٹر کی ہدایت تک کو لوگ کس طرح اپنے انداز میں ڈھال لیتے ہیں اس کی ایک مثال دیکھئے:

**کافی کا کپ**

اک بالٹی نما کپ بیٹھے تھے لے کے حضرت
پوچھا گیا یہ ان سے صاحب یہ کیا حماقت
بولے کہ ڈاکٹر نے
باندھا ہوا ہے اب کے
دن میں ایک ہی کپ کافی کی ہے اجازت[۱۴]

ڈاکٹر انعام الحق جاوید بھی مزاحیہ شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور انہوں نے لمرک سمیت کئی اصناف میں تجربے بھی کئے ہیں۔انہوں نے زیادہ لمرک نہیں لکھیں تاہم اس کے باوجود ان کی کتاب ''خوش کلامیاں'' میں بھی دو عدد لمرک نظمیں شامل ہیں جن کا رنگ مزاحیہ ہے۔ان دونوں کا عنوان بھی ''لمرک'' ہی رکھا گیا ہے۔ایک ایسی ہی نظم ملاحظہ کیجئے:

**لمرک**

سوچتا ہوں کیوں نہ اپنی کار کو
بیچ دوں اور اپنے پلے سے
کچھ رقم اور ڈال کر اس میں
اک نیا سائیکل ہی لے آؤں
دن کا سکھ رات کا سکوں پاؤں[۱۵]

☆☆☆☆☆☆

## حوالہ جات:


۱۔(https://www.masterclass.com/articles/poetry-101-what-is-a-limerick-in-poetry-limerick-definition-with-examples#examples-of-limericks-in-poetry

۲۔سہیل احمد خان، ڈاکٹر (۲۰۰۵ء) منتخب ادبی اصطلاحات؛ لاہور؛ شعبہ اردو، جی س یونیورسٹی؛ (ص 125)

۳۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۹۹)

۴۔فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (۲۰۱۲ء) اردو شاعری کا فنی ارتقا؛ لاہور الوقار پبلی کیشنز؛ 547

۵۔ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر؛ اصناف اردو؛ بک کارنرز؛ جہلم؛ ۲۰۱۸ء؛ ص ۱۹۴

۶۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۹۹

۷۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۹۹

۸۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۹۹

۹۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۱۰۰

۱۰۔نذیر احمد شیخ؛ لمرک؛ مشمولہ خوش نما؛ ص ۱۰۰

۱۱۔http://naveedzafarkiani.wordpress.com/page/15/ (۱۳ستمبر۲۰۱۲)

۱۲۔http://naveedzafarkiani.wordpress.com/2013/07/18/ بہرہ۔لمرک/(۱۸جولائی۲۰۱۳)

۱۳۔https://naveedzafarkiani.wordpress.com/tag/%D9%84%D9%85%D8%B1%DA%A9/

۱۴۔https://naveedzafarkiani.wordpress.com/tag/%D9%84%D9%85%D8%B1%DA%A9/

۱۵۔انعام الحق جاوید، ڈاکٹر؛ خوش کلامیاں؛ اسلام آباد؛ مکتبہ فانوس؛ ۱۹۹۲ء؛ (ص ۶۵)



**Cell. No. 0321-4758717 & 0335-4758777**
**Email id: irfan.ahsan@ue.edu.pk &**
**pashajee4u@yahoo.com**

# مولوی محمد شرف الدین

محمد سعید الدین فرخ

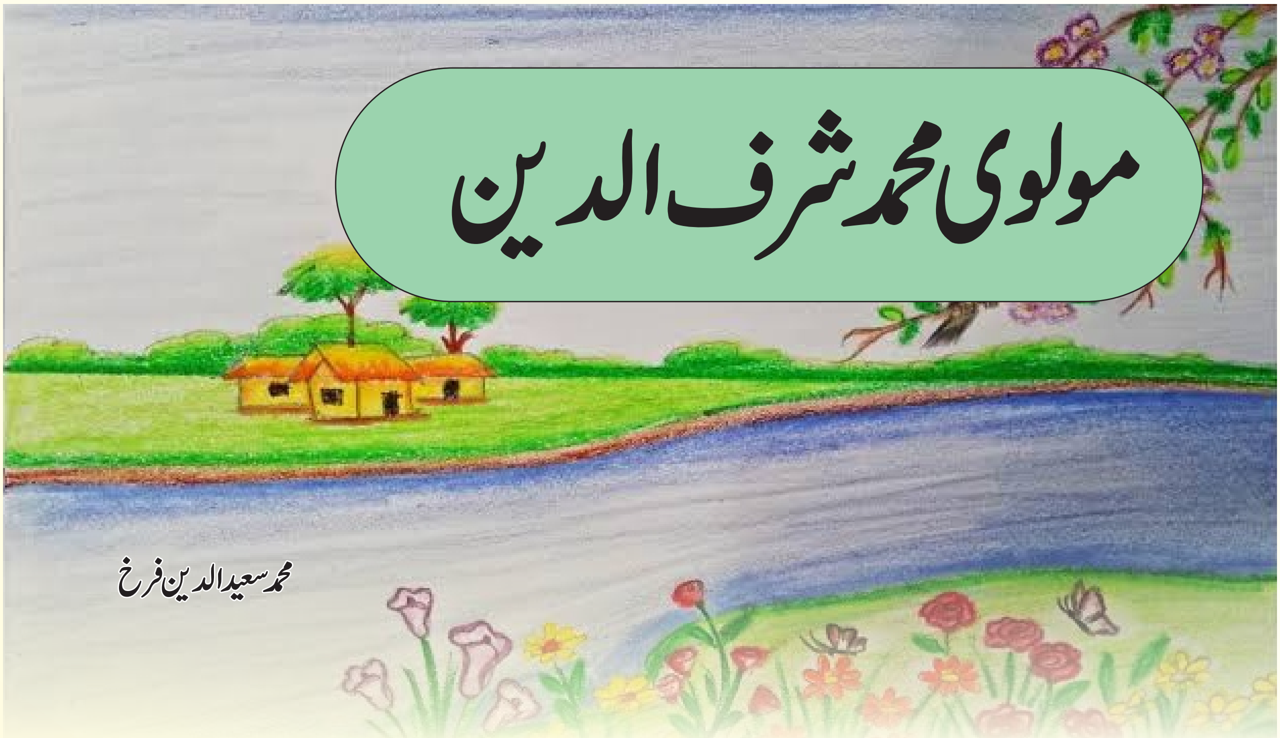

مولوی شرف الدین محمد عبد القادر ان عربی النسل سے ہیں جنہوں نے براہ راست عرب سے سواحل ہند میں توطن اختیار کیا۔جنوب ہند میں اس خاندان کی وجاہت مشہور ہے۔اس خاندان کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ کم از کم پندرہ پشت سے مسلسل علمی خدمت میں مصروف رہا ہے۔ایسی مثال بہت کم ملتی ہے جنکی علمی وعملی خدمات نے عام اعتراف وتحسین حاصل کرلیا ہے۔موصوف کے بزرگ صرف مملکت کے سچے بہی خواہ اور مخلص کارکن رہے ہیں۔

مولوی شرف الدین محمد عبد القادر کی پیدائش ۱۸/جمادی الثانی ۱۳۳۰ء یوم دوشنبہ 1912ء ۳ ساعت شب کو حضرت پڑنانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب (فصلی) مرحوم ومغفور کے عالی شان بنگلے حیدرآباد میں ہوئی۔ان کے والد حاجی قادر مرتضیٰ حسین صاحب محکمہ مال میں تحصیلدار تھے۔ان کے تین صاحب زادے تھے۔بڑے برہان الدین حسین مرحوم (نائب ناظم زراعت)،دوسرے مولوی شرف الدین اور تیسرے ڈاکٹر محمد یوسف الدین مرحوم (سابق صدر شعبہ مذہب وثقافت عثمانیہ یونیورسٹی)۔ محمد شرف الدین کے والد حاجی قاضی مرتضیٰ حسین کی رفیقہ حیات امتہ الغنی نورالنساء مولوی عبدالقادر صاحب رجسٹرار بلدہ کی صاحبزادی تھیں۔ترپ بازار میں ان کا قیام تھا۔

مولوی محمد شرف الدین کی ابتدائی تعلیم اشرف المدارس میں ہوئی پھر دارالعلوم سے انہوں نے 1937ء میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔9/مارچ 1939ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے معاشیات میں بی۔اے کیا۔مولوی محمد شرف الدین صاحب کی شادی اپنے بڑے ماموں مولوی قطب الدین محمد عبدالرؤف صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ۱۳۵۰ھ میں ہوئی۔

حیدرآباد دکن میں کوئی صنعتی نمائش کا نام لیتا ہے تو مولوی شرف الدین آنکھوں میں پھر جاتے ہیں وہ اس کے بانیوں میں سے بھی تھے اور مسلسل نوبرس تک اس کے اعزازی معتمد بھی رہے۔ان کی خدمات کے اعتراف میں 1948ء میں حیدرآباد کی طرف سے انہیں ''تمغہ خسرودکن'' دیا گیا۔اس ایک تمغے سے ان کی خدمات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔مولوی شرف الدین محمد انجمن طیلسانین کے ابتدائی اراکین میں سے تھے۔اس ادارے کی انہوں نے انتھک خدمات انجام دیں۔

وہ خاموش کام کرنے والے اور سنجیدہ مزاج کے آدمی تھے۔اکہرا

بدن ،لمبی گردن، سرخ وسفید رنگ، عربی چہرہ، اونچی ناک کوئی بھی انہیں دور سے دیکھتا تو پہچان جاتا کہ خاندان نوائط میں سے ہیں۔سلطنت ارکاٹ کی تباہی کے بعد اس خاندان کے بہت سے افراد جنوبی ہند سے حیدرآباد منتقل ہوئے ۔حیدرآباد دکن میں اس خاندان کا ایک علمی مقام اور وقار تھا۔''دکن میں اردو'' کے مصنف مولوی نصیر الدین ہاشمی بھی اسی خاندان کے فرد تھے ۔ہاشمی صاحب،مولوی محمد شرف الدین کے حقیقی ماموں تھے۔

مولوی محمد شرف الدین صاحب ایک زمانے میں باغ عامہ اورانجمن طیلسانین کے دفتر میں ہی نظر آتے تھے۔

نمائش کی جگہ جب باغ عامہ سے نامپلی روڈ پر منتقل ہوئی پھر وہ وہاں دیکھے جانے لگے۔ یہ اللہ کے ان بندوں میں سے تھے جن کی زندگیوں میں تفریح کوئی چیز نہیں ہوتی۔کام ہی سب کچھ ہوتا ہے اور کام ہی ان کی تفریح بن جاتا ہے۔

اس وقت جامعہ عثمانیہ اڈکمیٹ ،کیمپس میں چلی گئی تھی اور وہاں عارضی عمارتوں میں تمام شعبے دفاتر اور اقامت خانے بھی منتقل کردیئے گئے تھے ۔1937ء میں مولوی شرف الدین بی ۔اے میں آئے تو اسی سال معاشیات کے نصاب کو بڑھا کر اسے ایک مستقل شعبہ بنادیا گیا ورنہ اس سے پہلے اس کی تعلیم ایک جزوی مضمون کی حیثیت سے ہوتی تھی اسے مستقل شعبہ بنانے میں پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کا بڑا ہاتھ تھا ۔بینک کاری اور مالیات کے معاملات اور مسائل دن بدن بڑھتے اور پھیلتے جارہے تھے اس لئے یہ فیصلہ حیدرآباد کی نئی نسل کے لئے بڑا مبارک ثابت ہوا۔پانچ سال کے عرصے اس شعبے سے ایم ۔اے کر کے ایسے طالب علم نکلے جنہوں نے نہ صرف حیدرآباد اسٹیٹ بینک کی ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا بلکہ جیسے ہی پاکستان وجود میں آیا جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں نے پاکستان اسٹیٹ بینک(Pakistan State Bank)اور نیشنل بینک(National Bank)،وزرات معاشی منصوبہ بندی کے علاوہ دوسرے کاروباری بینکوں کو بھی سنبھالا جیسے ڈاکٹر سعید احمد مینائی،عطاءالرحمٰن علوی،ابن ایم ۔اے۔کاظمی ،غیاث الدین ادریس مینائی،تقی ہاشمی،محمد احمد سبزواری باقر خان وغیرہ۔

شرف الدین صاحب شعبہ معاشیات کی پہلی کھیپ کے گریجویٹ ہیں۔بی ۔اے کر کے محکمہ صنعت وحرفت میں ملازم ہوگئے۔ ان کی زندگی محنت سے عبارت تھی آخر اس انتھک محنت نے رنگ دکھایا۔

انجمن طیلسانین اور مجلّہ طیلسانین کی بہاران ہی کے دم سے تھی وہ نہ صرف مجلّہ کی اشاعت،طباعت اور ترتیب میں ہاتھ بٹاتے تھے بلکہ خود بھی اس میں مضامین اور تبصرے لکھتے تھے۔انہوں نے مجلّہ میں قسط وار ایک طویل مضمون لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا اس کا عنوان تھا ۔''ہندوستانی معاشیات کے مبادی''عرصہ تک یہ کتاب نصاب میں شامل تھی اس کے دو سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ان کی دوسری تصنیف جس کی بڑی تاریخی اہمیت ہے وہ''عثمانین کے تالیفات اور تراجم''کے نام سے شائع ہوئی ہے اب تک یہ پانچ مرتبہ چھپ چکی ہے ۔برصغیر کی چھپنے والی بہت کم کتابوں کے چار سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم کا حکم ہے کہ ......''سیروافی الارض''..... کہ دنیا میں گھومو پھرو۔ مولوی شرف الدین کو عثمانیہ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران سیر وسیاحت کا کافی موقعہ ملا۔یہی ان کا واحد تفریحی مشغلہ تھا لیکن اس کا بڑا مقصد بھی معاشی،صنعتی اور تجارتی معلومات جمع کرنا تھا۔ان کے تین سفرنامے چھپ چکے ہیں۔ ۱) جنوبی ہند اور لنکا کا تعلیمی سفر ۲) کشمیر میں تین ہفتے اور ۳) کچھ دن شمالی ہند میں۔

مولوی شرف الدین عثمانیہ یونیورسٹی کے ان ہونہار سپوتوں میں سے تھے جنہوں نے حیدرآباد کی معاشی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔وہ نہ صرف کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ مسلسل نو سال تک مجلس نمائش کے معتمد بھی منتخب ہوتے رہے۔ان کی محنت لگن،انتھک کوششوں اور بےلوث خدمات کی بدولت صنعتی نمائش وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

شرف الدین صاحب(مرحوم) کو ملک کی صنعت وحرفت خصوصاً دیہی اور گھریلو صنعتوں سے گہری دلچسپی تھی ۔اس غرض سے انہوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں کا بلکہ بیرون ہند مختلف ممالک کا دورہ کر کے صنعت وحرفت اور تجارت کے متعلق گہری معلومات حاصل کی تھیں۔

انہوں نے متعدد تحقیقاتی مضامین لکھے اور کئی کتابیں شائع کیں۔ ہندوستانی معیشت پر ان کی گراں قدر کتاب ''ہندوستانی معاشیات کے مبادی'' بڑی مقبول ہوئی اور ''اسلامی دنیا کے معاشی حالات'' بھی ان کا ایک علمی کارنامہ ہے۔ انتقال سے پیشتر وہ ''دنیائے صنعت وتجارت'' کی تکمیل میں مصروف تھے۔وہ مجلّہ طیلسانین، ماہ نامہ روح ترقی اور ماہ نامہ شہاب کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے۔مجلّہ عثمانیہ، ماہ نامہ آجکل سب رس، حسن کار وغیرہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ان رسالوں کے علاوہ وہ ملک کے ممتاز اخباروں جیسے روز نامہ صحیفہ، مشیر دکن ، رہبر دکن ، میزان ، خلیق اور سلطنت وغیرہ میں بھی لکھتے رہتے تھے۔عرصہ تک نمائش بلٹن کے مدیر بھی رہے ۔اپنی کتابوں ،مقالوں اور ''نمائش بلٹن'' کے ذریعہ انہوں نے ملکی مصنوعات کی ترقی اوران کے تشہیر میں گراں قدر حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ مرحوم کی بدولت قدیم ہندوستانی صنعتیں جو مٹ رہی تھیں نئی زندگیاں پالی اورجدید صنعتیں رائج ہوئیں۔
مولوی محمد شرف الدین صاحب کی کتابوں کا ایک اجمالی تعارف پیش ہے۔

**ہندوستانی معاشیات کی مبادی** : یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

**موضع پھول مری کی معاشی تحقیق** یہ کتاب پہلی ۱۹۴۶ء شائع ہوئی ۔دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا۔

**عثمانین کے تراجم وتالیفات:**

**تحفۂ نمائش** : مجلس نمائش نے بڑے اہتمام سے اس مصور تحفہ نمائش کو ۱۳۰۴ف شائع کیا تھا۔

**دنیائے نمائش** : یہ کتاب بھی ۱۳۰۴ف میں شائع ہوئی۔

**مملکت آصفیہ کی صنعتی ڈائرکٹری**:۔ ۱۳۵۲ف اور ۱۳۵۵ف میں شائع کی گئی تھی۔جو بڑی مقبول ہوئی۔

**اسلامی دنیا کے معاشی حالات**: اس میں جملہ اسلامی ملکوں کی نسبت مختصر۔

**قرآنی صنعتیں**: شرف الدین صاحب نے قرآن مجید کے ذکر کردہ صنعتوں پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا اور دوسری بار ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔

**مضامین محبوب**: ''مضامین محبوب'' مولوی شرف الدین محمد عبد القادر محبوب کے مضامین کا مجموعہ ہے نے گویا ایک خوبصورت گلدستہ میں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۲۱ء شائع ہوئی۔

**حیدرآبادی صنعتی نمائش کی تاریخ** : محمد شرف الدین نے کتاب میں اپنے مختلف مضامین کے ذریعہ نمائش کی تاریخ،اس کے قیام مقصد اور دیگر تفصیلات پر جامع روشنی ڈالی ہے۔یہ کتاب ۲۰۲۳ء شائع ہوئی۔

☆☆☆

**Mohammad Sayeeduddin Farrukh**
11-3-855, New Mallepally, Hyderabad -500 001 (T.S.)
**Mobile: 7893573855**
E-mail Id:mohdfarrukh77@gmail.com

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم

# ناول: راجدیو کی امرائی پر ایک نظر

ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر

ڈاکٹر حبیب النساء بیگم
صدر شعبہ اردو
ڈی۔ ایس۔ ایم کالج پربھنی

اردو ادبی دنیا میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر ایک مشہور و معروف نام ہے۔ وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں ۔ بحیثیت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، تنقید نگار، سوانح نگار، بچوں کا ادب، شخصیت نگاری، طنز و مزاح غرض مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صادقہ نواب سحؔر اردو ہی نہیں ہندی شعر و ادب کا بھی معتبر نام ہے اور دونوں زبانوں میں ان کا کام کافی قابل تعریف ہے۔

''خلش بے نام سی'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے اس میں کل سولہ افسانے ہیں۔ ''مکھوٹوں کے درمیان'' بہترین ڈراموں کا مجموعہ ہے اس میں کل دس ڈرامے ہے۔ یہ تمام ڈرامے سماجی اور نفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ ہر ڈرامہ کا مقصد اصلاح ہے۔

پہلا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' دوسرا ناول ''جس دن سے'' شائع ہو کر قارئین کی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اب تیسرا ناول ''راجدیو کی امرائی'' ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ امید ہے کہ دوسرے ناول کی طرح یہ ناول بھی آسمان کی بلندیوں کو چھو لے گا۔

ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے: چپلوں تعلقہ سے دس کلو میٹر دور'' شیتر پرشورام'' نام کا ایک چھوٹا سا خوبصورت پہاڑی گاؤں جہاں صرف برہمن رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک گھر پنڈت رام داس جوشی جو بہت مفلسی میں زندگی گزارتا ہے ان کا لڑکا لکشمن جو بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ پنڈت رام داس جوشی کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا لکشمن پنڈتائی نہ کر کے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے اور خوب ترقی کرے جس طرح سے ہر ہندوستانی ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد ماں باپ کا نام روشن کرے۔ چنانچہ لکشمن پڑھ لکھ کر کلکتہ ریلوے میں کلرک کی نوکری کرتا ہے اور ترقی کرتے کرتے ریلوے کا چیف بن جاتا ہے اور ممبئی میں بس جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو بھی ممبئی بلاتا ہے لیکن وہ اپنے گاؤں میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں وقت گزرتا ہے لکشمن کو دو لڑکے بڑا لڑکا ڈاکٹر راگھو اور دوسرا لڑکا بھاویش۔ دونوں لڑکوں کی شادی ہو جاتی ہے بڑی بہو پڑھی لکھی اور دوسری بہو گھریلو ہوتی ہے۔ سب اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارتے ہیں۔

۱۹۴۸ء کے ہندو مسلم دنگوں سے لکشمن بہت متاثر ہوتا ہے اور وہ نوکری سے ریٹائرمنٹ لے کر اپنے آبائی گاؤں شیتر پرشورام آ کر کھیتی کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

ڈاکٹر راگھو کو کوئی اولاد نہیں ہوتی ایک لڑکا آٹھ سال کی عمر میں ہی دماغ کی ٹی بی کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ بھاویش کو تین لڑکے راجدیو، کرن اور ویر۔ ڈاکٹر راگھو ہندوستانی بھائی کی بہترین مثال ہے اسے اپنے چھوٹے بھائی سے بے پناہ محبت ہوتی ہے اور ہر وقت وہ اپنے بھائی کا خیال رکھتا ہے۔ باپ لکشمن کے مرجانے کے بعد جائیداد دونوں بھائیوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ کم عمر میں ہی بھاویش سیٹھ بن جاتا ہے۔ الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے کبھی جیت تو کبھی ہارتا ہے۔ اس طرح سے بھاویش کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ شراب پینے کی وجہ سے اس کے جگر خراب ہوجاتے ہیں اور ۴۱ سال کی عمر میں بھاویش کی موت ہوجاتی ہے۔ چھوٹے بھائی کی موت کے بعد ڈاکٹر راگھو بھابھی سرسوتی اور تینوں لڑکوں کو اپنے گھر لاتا ہے۔ باپ کی طرح بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ بچے ڈاکٹر راگھو کو بڑے پاپا اور اس کی پتنی کو کاکی کہتے ہیں۔ راجدیو پڑھ لکھ کر لیب اسسٹنٹ کی نوکری کرتا ہے اس کے لیب میں اونتکا نامی ایک لڑکی راجدیو سے محبت کرتی ہے۔ جو دیکھنے میں زیادہ خوبصورت نہیں مگر پُرکشش ہوتی ہے۔ دونوں کی عمر میں کافی فرق ہوتا ہے مگر محبت میں انسان عمر نہیں دیکھتا۔ بڑے پاپا دونوں کی شادی کراتے ہیں۔ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ شادی کے کچھ سال کے بعد کاکی راجدیو سے الگ رہنے کو کہتی ہے اس کا کہنا ہے کہ:

"گھنے پیڑ کے سائے میں رہے گا تو پورا آکاش کیسے دیکھے گا" ا ص ۴۸

اس طرح کاکی کے کہنے پر راجدیو کی پوری فیملی الگ رہنے لگتی ہیں۔ اونتکا سسرال کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہتی ہے دل وجان سے سب کی سیوا کرتی ہے۔ راجدیو ایک کامیاب بزنس مین بن کر خوب ترقی کرتا ہے۔ پراپرٹی پہ پراپرٹی خریدتا ہے۔ چپلون میں آم کا باغیچہ خریدتا ہے جس میں چالیس ہاپوس آم کے درخت ہوتے ہیں۔ راجدیو کو تین لڑکے بڑا لڑکا کشل جو ڈاکٹر بنتا ہے دوسرا لڑکا موہت آرکیٹکٹ اور تیسرا لڑکا انجینئر ہوتا ہے۔ راجدیو نے اپنے تینوں لڑکوں کی تعلیم وتربیت اچھے سے کی اور انھیں قابل بنایا۔ ہندوستانی ماں باپ کا فرض اچھے سے نبھایا۔ راجدیو ہندوستانی باپ کی ایک بہترین مثال ثابت ہوتا ہے۔

اپنی بیوی اونتکا کو بھی اس نے کئی کورس جیسے امرائیڈری، فوٹو گرافی اکاؤنٹس بزنس کا کورس بھی کرایا۔ دنیاداری کے ساتھ ساتھ بزنس کے داؤ پیچ بھی سکھائے۔ راجدیو سیر وتفریح کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو سنگاپور، کشمیر وغیرہ ساری دنیا کی سیر کرائی۔ ہر سال تہوار کے موقع پر سونے کے زیورات بھی اونتکا کو بطور تحفہ دیتا ہے۔ ہر لحاظ سے اس نے اپنی پتنی کا خیال رکھا ایک ہندوستانی باپ اور پتی کے تمام فرض ادا کیے۔

راجدیو جب بھی چپلون اپنی امرائی میں جاتا تو وہاں پر کینٹین میں کھانا کھاتا اور یہ کینٹین ایک عورت چلاتی ہے جس کا نام تلسا ہوتا ہے۔

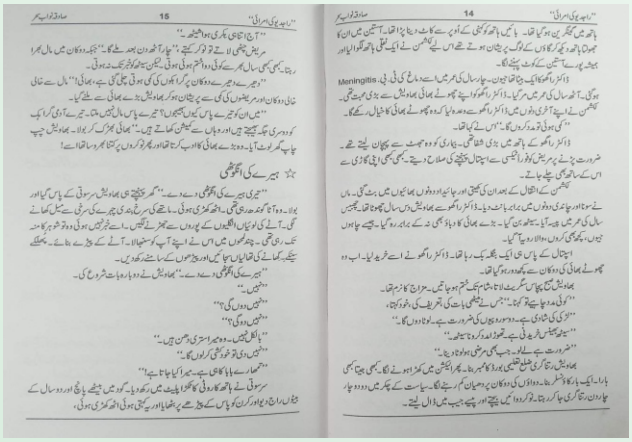

تلسا خوش مزاج عورت ہوتی ہے وہ اپنے گاہکوں سے ہنس بول کر باتیں کرتی ہیں۔ تلسا کا پتی شرابی ہوتا ہے۔ ایک دن وہ اونتکا کے کان بھرتا ہے کہ تلسا اور اس کے پتی راجدیو کا چکر چل رہا ہے۔

کہانی یہاں سے ایک نیا موڑ لیتی ہے اونتکا کے دل میں شک بیٹھ جاتا ہے۔ ہندوستانی عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن دوسری عورت کبھی نہیں۔ اس کا شک دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ ایک دن راجدیو کا بڑا لڑکا ڈاکٹر کشل اسپتال کو ایرکنڈشن بنانے کے لئے پچیس لاکھ روپے مانگتا ہے باپ کے انکار کرنے پر کشل بہت ناراض ہوتا ہے۔ اونتکا بھی کشل کو روپے نہ دینے کی وجہ سے پتی راجدیو سے بہت ناراض ہوتی ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ اونتکا راجدیو کو گھر سے نکال دیتی ہے۔ ڈاکٹر کشل بھی اپنی ماں کا ساتھ دیتا ہے۔ راجدیو جب چہل قدمی کر کے گھر واپس آتا ہے تو گھر کے باہر راجدیو کو ایک بھرا بیگ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں:

اونتکا دروازے میں یوں کیوں کھڑی ہو؟ میرے ہاتھ سے دودھ کی تھیلی بھی نہیں لیتی۔ میں نے نرمی سے کہا۔

"دروازے میں کھڑا رکھے ہوئے ہو! اور یہ دوسوٹ کیس!!

’’آپ کے کپڑے اور ضرورت کا سامان‘‘ یہ کیا ناٹک لگا رکھا ہے!

’’کشل کو پیسے دے دو‘‘ وہ بولی

تم کیوں نہیں دیتی تمہارے پاس بیس لاکھ ہیں نا!

میرا پیسہ نہیں دونگی۔ آپ دے دیجئے آپ کے پاس بہت ہیں‘‘۔

۲؎ ص ۹۴

اس دن کے بعد راجد یو اپنے فیملی سے الگ رہنے لگتا ہے۔ باپ نے پڑھایا ڈاکٹر بنایا، اسپتال کھول کر دیا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ڈاکٹر کشل کی باپ کے روپیوں پر نظر ہوتی ہے۔ باپ کے انکار کرنے پر وہ آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔

’’کون کہتا ہے کہ ظلم صرف عورت پر ہی ہوتا ہے یہاں پر تو ظلم راجد یو پر ہوا ہے‘‘۔

آخر کار نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ اونتکا تلسا کی وجہ سے اور کشل کو روپئے نہ دینے کی وجہ سے بہت ناراض رہتی ہے اور راجد یو پر کیس کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر نے ایک ایسے عورت کی تصویر پیش کی ہے جو پڑھی لکھی نئے زمانے کی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو اپنے وجود پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ ہر طرح کا سامنا مضبوطی سے کرتی ہے۔ ضرورت پڑھنے پر وہ عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹاتی ہے۔ اونتکا عدالت سے طلاق کی مانگ کرتی ہے اور اپنے لیے ماہانہ پچیس ہزار روپئے کی ڈیمانڈ کرتی ہے۔ راجد یو طلاق نہیں چاہتا اور وہ پچیس ہزار روپئے دینے سے انکار کرتا ہے۔ اونتکا پچیس ہزار پر ہی اڑی رہتی ہے۔ آخر کار راجد یو دس ہزار روپے دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔

راجد یو کو اپنے فیملی سے دور رہنا پڑتا ہے اونتکا اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ مگر بیوی بچوں کی جدائی اسے پریشان کرتی ہے۔ راجد یو اپنے پوتا پوتی سے ملنے کے لیے ترستا ہے۔ اسے چوروں کی طرح چھپ کر ملنا پڑتا ہے چوری چوری فون لگانا پڑتا ہے۔ لیکن اونتکا کا دل نہیں پگلتا۔ ایک دن وہ واٹس ایپ پر میسج لکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

’’اب تم خود کفیل ہو۔ میرا پیسہ، میرا گھر، میرے بیٹے
تمہیں یہ گھمنڈ ہے۔ اب تمہیں میری ضرورت نہیں

مرد عورت کے ساتھ ایسا کرے تو یہ ظلم۔ اگر میری جگہ
تم ہوتیں تو کیا ہوتا! بتاؤ؟ جو تم نے میرے ساتھ کیا
وہ میں۔۔۔۔۔۔‘‘

۳؎ ص ۱۶۹

اس ناول میں راجد یو پر ظلم ہوا ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کی۔ اونتکا کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ فلیٹ اس کے نام پر کیا۔ بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا قابل بنایا تاکہ وہ اپنی زندگی خوشحالی سے گذار سکے۔ کیا یہ سب کر کے راجد یو نے بہت بڑی غلطی کی؟ اس کے غلطی کی سزا یہ ملی کہ اسکی بیوی اور بچوں نے ہی اسے گھر سے نکال دیا۔ اس نے ہندوستانی باپ کا فرض اچھے سے نبھایا۔ لیکن جیسا آج ہمارے معاشرے کے حالات ہے کہ بچوں کو اپنے باپ سے نہیں بلکہ ان کے روپئے سے محبت ہوتی ہے روپئے نہ دینے کی وجہ سے ہی راجد یو کو گھر سے باہر نکال دیا گیا۔

صادقہ نواب سحؔر نے یہاں جس رشتے کی تلخی کا مظاہرہ کیا ہے وہ آج کے اس مادہ پرست معاشرے کی پہچان ہے۔ راجد یو کا اپنے بیٹے کشل کو روپیوں کے لیے منع کرنا کشل کی من کی کڑواہٹ بنتا ہے اور اسی کڑواہٹ میں وہ باپ کے خلاف قانونی ہتھکنڈوں میں ماں کی مدد کرتا ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ میں باپ کے خلاف بیٹوں کو بھڑکانا، شوہر کے روپیوں پر نظر رکھنا، کریمنل کورٹ میں جھوٹا کیس دائر کرنا اور ایک بڑی رقم کا مطالبہ کرنا قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

راجد یو کو اس عمر میں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ اس کو بیوی بچوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ ٹوٹتا نہیں۔ وہ بار بار سوچتا ہے کہ اس کی پرورش میں کوئی کمی تو نہیں رہی؟ دل بہلانے کے لیے وہ دوستوں

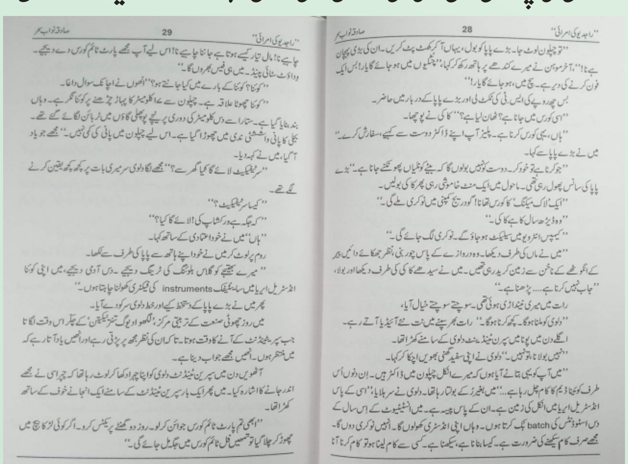

سے ملتا ہے۔ملک اور بیرونی ممالک کی سیر وسیاحت بھی کرتا ہے۔

صادقہ نواب سحؔر نے اس ناول میں سماجی رشتوں کی جو حقیقت بیان کی ہے وہ ہمارے معاشرے کی بہترین عکاس ہے۔

آخر کار راجدیو ڈاکٹر کشل کو ہیرے کی انگوٹھی اور بہت سارے برتن دیتا ہے۔ڈاکٹر کشل ہیرے کی انگوٹھی اور سارے برتن لیتا ہے۔مگر اس کے چہرے پر ذراسی بھی خوشی نہیں جھلکتی۔باپ سے مل کر وہ صرف مسکراتا ہے اسے باپ کے پیسوں سے پیار ہوتا ہے۔وہ سامان لینے سے انکار نہیں کرتا بیٹے کو سامان دے کر راجدیو ایک عجیب سا سکون محسوس کرتا ہے۔اس طرح ناول اپنے اختتام کو پہنچتا ہے ناول کا اختتام نہ خوشی پر ہوتا ہے اور نہ ہی غم پر بلکہ مطمئن بخش ہے۔آج ہمارے سماج میں ایسے بہت ساری مثالیں ملیں گی۔

ناول کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔مصنفہ نے چھوٹے چھوٹے عنوانات کو جوڑ کر کہانی کو مکمل کیا ہے۔ کہانی ایک برہمن بھکشو پنڈت رام داس جوشی اور اس کے چار نسلوں کی ہے۔پہلی نسل میں لکشمن جو ماں باپ کا فرمانبردار اور خوابوں کو پورا کرتا ہے ۔دوسری نسل میں ڈاکٹر راگھو اور بھاویش ہے ۔

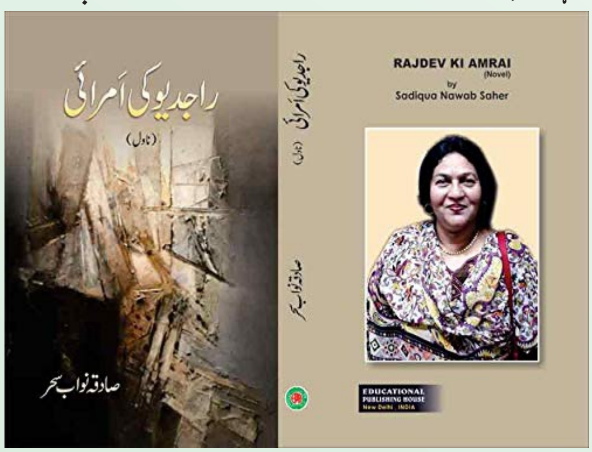


ڈاکٹر راگھو بھی فرمانبردار بیٹا ثابت ہوتا ہے۔ایک ہندوستانی بھائی کی طرح اپنے غریب بھائی کا مرتے دم تک ساتھ دیتا ہے۔بھائی کے مرنے کے بعد بھی اس کے دونوں لڑکوں کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کرتا ہے اپنے گھر میں سہارا دیتا ہے۔تیسری نسل میں بھاویش کے لڑکے راجدیو ، کرن اور ویر ہے۔چوتھی نسل میں راجدیو کے لڑکے ڈاکٹر کشل ،موہت۔ڈاکٹر کشل کو ماں باپ سے زیادہ ان کے پیسوں میں دلچسپی ہوتی ہے۔ایسے چار نسلوں کی کہانی کو مصنفہ نے پیش کیا ہے۔ ہمارے سماج میں آج بھی کچھ ایسے خاندان ملیں گے جو نسل در نسل اپنے بزرگوں کی عزت کرتے ہیں۔اس کہانی میں بھی تین نسلوں میں آپس میں میل ملاپ نظر آتا ہے۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ رشتوں میں بھی بکھراؤ نظر آتا ہے۔جیسا کہ چوتھی نسل کا ڈاکٹر کشل ۔باپ کے روپئے نہ دینے کی وجہ سے وہ باپ سے بے حد ناراض ہوتا ہے اور اس کی بیوی سسر سے کولہاپوری چپل کے اور ساس کے آنکھ کے آپریشن کے روپئے مانگ کرتی ہے۔ بہو کے اس برتاؤ کی وجہ سے سسُر بے حد تعجب زدہ ہوتا ہے۔کہانی میں بیانیہ پر زور دیا گیا ہے۔

ناول کا پلاٹ بہت مربوط ہے۔تمام واقعات ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔ناول کے مطالعہ کے وقت قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ’’راجدیو‘‘ ہے۔اسی کے اطراف کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔راجدیو بزنس میں خوب ترقی پر ترقی کرتا ہے اور ایک کامیاب بزنس مین بن جاتا ہے۔صادقہ نواب سحؔر نے ناول میں راجدیو کو ایک متحرک اور فعال کردار کے روپ میں پیش کیا ہے۔کہانی میں جگہ جگہ وہ خود کا محاسبہ کرتا ہے کہ اس کی پرورش میں کہیں کوئی کمی تو نہیں تھی ایسے وقت میں جب اس کی آنکھ کا آپریشن ہوتا ہے۔ جب اس کو پتنی اور اس کے بیٹوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے تو اس کی پتنی اور بیٹے کوئی بھی مدد کو نہیں آتے۔تب اس کا دل تڑپتا ہے اور وہ اونتکا کو یاد کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

’’ اونتکا! کاش تم میرے ساتھ ہوتیں تو ایسی لاپرواہی نہ ہوتی‘‘ ۴ ص ۱۴۰

صادقہ نواب سحؔر نے اس ناول میں سماجی رشتوں کی جو حقیقیت بیان کی ہے وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ڈاکٹر راگھو کا کردار بھی قاری کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے وہ ایک ہندوستانی بھائی کی بہترین مثال ثابت ہوتا ہے۔راجدیو کی ماں سرسوتی کا کردار بھی ہندوستانی عورت کی بہترین مثال ہے وہ اپنے جیٹھانی کے ہر حکم کا پالن کرتی ہے مگر اس کے سامنے اُف تک نہیں کرتی۔مثبت کرداروں میں جیٹھانی یعنی کاکی ،راجدیو کے بھائی کرن ،ویر، انور،نشا دشامل ہے۔منفی کرداروں میں راجدیو کی پتنی اونتکا اور بے وفا ڈاکٹر کشل اس کی پتنی کا شمار ہوتا ہے۔اونتکا جو گھر اور رشتوں کے بکھراؤ کا سبب بنتی ہے۔ناول میں کرداروں کی بھر مار نہیں ہیں۔

صادقہ نواب سحر کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ ناول میں سادہ، سلیس اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے جو قاری کو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ثقیل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے اور فلیش بیک تکنیک کا استعمال بھی ہوا ہے۔

منظر نگاری میں بھی مصنفہ کو کمال حاصل ہے۔ ناول میں شیتر پرشو رام گاؤں، چپلون، اور امرائی کی بہترین منظر نگاری کی ہے۔ کچھ منظر نگاری

کے نمونے ملاحظہ فرمائیں:

''چپلون ایک ہرا بھرا شہر ہے نا! چاروں طرف کا جو، آم کٹھل، انناس کے باغوں اور چاول کے کھیتوں میں ہمیشہ ہریالی رہتی ہے۔ ۵؎ ص ۱۳

امرائی جو پوری پہاڑی پر بسی تھی۔ یہاں آم کے چالیس پیڑ تھے۔ پہاڑی سے اترتا ہوا بغیچہ بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ ۵؎ ص ۵۸

چپلون سے دس کلومیٹر دوری پر ایک پہاڑی پر بسے شیتر پرشورام علاقے کی صرف ایک ہی کشش ہے۔ بھگوان پرشورام کا مندر۔ ۶؎ ص ۱۷۹

عصری حسیت سے بھرپور یہ ناول ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

دوسرے ناول کی طرح اس ناول میں بھی مصنفہ نے ساری دنیا کی سیر کرائی ہے۔ سنگاپور، جاپان، گلیشئر، جنوبی افریقہ، کینیا وغیرہ۔ سحر صاحبہ نے ہر ایک مقامات کی منظر نگاری اس طرح سے کی ہے کہ وہ قاری کے سامنے محاکات کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں۔ مصنفہ نے جس خوبی کے ساتھ تمام مقامات کا تعارف دیا ہے اس سے ان کی جغرافیائی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کے پاس موضوعات کی کمی نہیں ہیں۔ عصری مسائل کو انھوں نے اپنی ناول کا موضوع بنایا ہے۔ دوسرے ناول کی طرح اس ناول کا مواد بھی ہندوستان کے معاشرتی مسائل سے تیار کیا ہے۔ یہ ناول بھی ادبی دنیا میں اپنا مقام ضرور حاصل کرے گا۔

☆☆☆

## حوالہ جات


۱؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۴۸

۲؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۹۴

۳؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۱۶۹

۴؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۱۴۰

۵؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۱۳

۶؎ صادقہ نواب سحر — راجدیو کی امرائی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۹ء ص ۵۸



**Dr.Habibunnisa Begum**

Asst. Proffessor

Dept of Urdu D.S.M. College Parbhani.

Mob. 9561580046

# دھنک کا نظریاتی مطالعہ

سلیم طالب

خطۂ پیر پنچال سے ہم عمومی طور پر ضلع پونچھ اور راجوری کے علاقہ جات مراد لیتے ہیں۔ یہ خطّہ جہاں اپنی قدرتی خوبصورتی اور رنگا رنگی کے حوالے سے ایک منفرد پہچان رکھتا ہے وہیں دوسری اور اس خطے میں اردو شعر و ادب کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ عرصۂ دراز سے یہاں متعدد ادباء و شعراء اردو ادب کی قندیل کو جلاتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات اور اپنے عہد کی حسیاتی لہروں کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین سے بہت سی علمی و ادبی شخصیات نے جنم لیا اور سماج کی خدمت میں مصروفِ عمل رہ کر ملکی و قومی سطح پر اپنا اور اپنے خطے کا نام روشن کیا۔ ان شخصیات میں ایک اہم بالغ النظر نام فاروق مضطر صاحب کا بھی ہے۔

مضطؔر صاحب نہ صرف شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ ایک صحافی، سماجی کارکن اور ماہرِ تعلیم کے طور پر بھی مشہور و مقبول ہیں۔ چوں کہ آپ نے ۱۹۷۳ء میں ''دھنک'' نامی ادبی جریدہ کی اشاعت سے خود کو بطورِ صحافی متعارف کروایا۔

یہ ایک مکمل ادبی جریدہ تھا جو بزمِ ادب تھنہ منڈی کی ایما پر فاروق مضطر کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ خطّہ پیر پنچال ہی نہیں بلکہ ریاستی سطح پر دھنک اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جس کے ذریعے فاروق مضطر نے یہاں کے ادبی حلقوں میں جدید رنگ و آہنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی۔

یہ وہ وقت تھا جب شمس الرحمٰن فاروقی شب خون کے ذریعے باقاعدہ طور پر جدیدیت کے رجحان کو متعارف کروا چکے تھے۔ فاروق مضطر کی تخلیقات بھی شب خون میں شائع ہونے لگیں، جس کا مفہوم یہ ہوا کہ فاروق مضطر نے شعوری طور پر جدیدیت کے رجحان کو اپنا لیا تھا۔ فاروق مضطر چونکہ ایک ایسی دور اندیش اور بالغ النظر شخصیت ہیں کہ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں اور حالی کے اس شعر کے مصداق ہیں ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

یہی سبب ہے کہ وہ نتیجتاً شمس الرحمٰن فاروقی کے نظریات سے متاثر ہو گئے۔ انہوں نے جدیدیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اپنے پرانے کئی بیاض جلا دیئے اور نئے انداز سے لکھنا شروع کیا۔ بقول مضطر صاحب کہ 70

کی دہائی میں چند ہی لوگ جموں وکشمیر میں شب خون سے واقف تھے۔ یہاں بے شمار دانشور ادباء وشعراء اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے تھے۔لیکن ان کا انداز و آہنگ اب بھی پرانی شاہراہوں سے دلچسپی رکھتا تھا، مضطر صاحب نے محسوس کیا کہ ہمارے خطّہ پیر پنچال اور ریاست بھر میں بھی نئے انداز سے ادبی کام ہونا چاہیے۔لہٰذا انہوں نے شب خون سے متاثر ہوکر شعوری طور پر جدیدیت کے رجحان کو پروان چڑھانے کے لئے بزمِ ادب تھنہ منڈی کی مشاورت سے ''دھنک'' نامی ادبی رسالہ کا آغاز کیا۔دھنک رسالہ شب خون کی اتباع میں شائع ہونا شروع ہوا اور بہت سے ادباء وشعراء کو ایک عمدہ پلیٹ فارم مہیا کیا۔ریاست کے کئی قلمکاروں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز دھنک سے ہی کیا اور پھر ریاستی اور ملکی سطح پر اپنا انفراد قائم کیا اور ادب کی خدمت کی۔

فاروق مضطر نے دھنک کی اشاعت سے ریاست جموں وکشمیر کے علمی وادبی حلقوں کو نئے رجحانات اور نئی طرزِ فکر سے روشناس کروایا۔آج کے دور کے بالمقابل جہاں انٹرنیٹ اور دیگر کئی قسم کی سہولیات موجود ہیں 70 کی دہائی میں ایک پسماندہ اور دور افتادہ خطے سے ایک مؤقر علمی، ادبی اور نظریاتی جریدے کا منظر عام پر آنا کوئی عام بات نہ تھی۔

فاروق مضطر نے شائع شدہ شمارہ نمبر ایک میں لکھتے ہیں؛

''دھنک'' کی اشاعت بزمِ ادب تھنہ منڈی (جموں) کی جانب سے سال 1973ء میں ہوئی اور اس کے نو (9) شمارے اگلے دو تین سالوں میں وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے۔ان وقتوں میں خطے میں دھنک نے ایک رجحان ساز مجلّے کا رول ادا کیا۔نئے ادبی رجحانات اور مباحث کے لیے شب خون اسٹائل میں دھنک کے صفحات وقف رہے۔یاد رہے کہ ملک اور ریاست کے بہت سے نامور شعراء اور افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز دھنک سے ہی کیا تھا۔آج ان کا نام شعر وادب کے تئیں ایک معتبر حوالے کا تشخص رکھتا ہے۔

اس وقت ہم نے دھنک کے مزاج ومعیار کو متعین کرنے کے لئے دوسرے رسائل وجرائد یا کتابوں سے چند معیاری نگارشات اخذ کی ہیں ،اس سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ دھنک بلند ذوق قارئین کو متوجہ کر سکے۔

دھنک کے اجراء سے ہمارا بنیادی مقصد ریاست جموں وکشمیر میں ادب و فن میں نئے نئے رجحانات ومیلانات سے علم دوستوں اور ادب پسندوں کو باخبر رکھنا اور تحریک وترغیب دینا ہے۔لہٰذا ان مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے دھنک کے صفحات وقف ہیں۔مگر ادب شرط ہے''۔

(دھنک شمارہ ۱، اداریہ)

دھنک کے تمام شماروں میں شعراء کی ایک بڑی تعداد ہے جن کا کلام نظمیں اور غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ان میں جدیدیت کے رجحان کی نمائندگی کرتے ہوئے نئی لفظیات ،استعارات،تشبیہات اور علائم کو خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے جس سے اشعار، میں نہ صرف حسن اور دلکشی پیدا ہوئی بلکہ تہداری اور معنویت بھی پیدا ہوگئی ہے، تاہم یہ بھی یاد رہے کہ بعض لوگوں کی لفظیات صرف لفظی شعبدہ بازی بن کر رہ گئی ہیں اور ان اشعار میں دور دور تک معنیاتی حسن کی کمی کھلتی ہے۔جموں وکشمیر کے متعدد شعراء وہ ہیں جو پہلے روایتی انداز میں ہی شاعری کر رہے تھے لیکن دھنک کے ذریعہ وہ نئے اسلوب کی طرف راغب ہوئے اور نئے تقاضوں کے مطابق جدید میکانکی اور مشینی دور میں انسانوں میں پائے جانے والی طلسماتی کیفیات کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

جن لفظیات اور علامتوں کو ان شعراء نے برتا۔ان میں دھوپ، پتھر، جنگل، خاک،صحرا، جنگ، سنگ، موسم، پیڑ، رات، غبار، سایہ، بارش، جسم، سورج، زمین، آسمان، برف، اندھیرا، دریا، سمندر، سڑک، شجر، ساحل، کمرہ، شعلہ، شام، زہر، پل، تیرگی، ریت، جنازہ، ذرّہ، آئینہ، پانی، سناٹا، جزیرہ، خیمہ، آگ، وہم، کرب، منظر، فرشتہ، خلاء، آندھی، عکس، سگریٹ، بازار، زیتون، لاش، سفر، قاتل، بیاباں وغیرہ شامل ہیں۔یہاں پر دھنک کے شماروں میں سے نمونے کے طور پر اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جن میں مذکورہ بالا خصوصیات کا عکس صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔مثلاً؛

میں تو تھا موجود کتاب کے لفظوں میں
وہی شاید مجھ کو پڑھنا بھول گیا

کرشن کمار طور

اتنا آسان نہیں خود سے گزرنا یارو
یہ تو اک آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے

عابد مناوری

یک بیک کالے سمندر شعلہ پیکر ہو گئے
اک شرر بھی ساحلوں کی سرد آہوں میں نہ تھا

حامدی کاشمیری

میرے اطراف ہیں کتنے ہی پرندے خاموش
ہے کوئی کامل فن کار سلیمانی میں

ہمدم کاشمیری

اس قدر شور شرابے میں رہا ہے مشغول
اپنی آواز کو بھی بھول چکا ہے کوئی

پرتپال سنگھ بیتاب

میں مسافر افق تا افق دھوپ کے سنگ فصلِ زمستاں کا لمحہ لئے
اور میرے تعاقب میں ہے تیرگی کو ہساری ہمہ گیر سایہ لئے

احمد شناس

جلا رہی ہیں جسے تیز دھوپ کی نظریں
وہ ابر باغ کی قسمت سنوار سکتا تھا

بلراج بخشی

اوس کے قطروں نے بھر لی تھیں اُڑانیں دور تک
سوکھے پتوں کی ڈالی اس لئے الجھن میں تھی

صابر مرزا

چہار سمت گھرا ہوں میں پانیوں میں یہاں
مرا یہ کرب کہ اک ڈوبتا جزیرہ ہوں

فاروق مضطر

رات کے اعصاب پر جب مردنی چھا جائے گی
شہر کا خالی بدن نیزوں سے چھیدا جائے گا

عتیق اللہ

مرے پڑوس کا انساں بہت ہے سادہ مزاج
وہ آ ہی جاتا ہے یارو ہر اک کی باتوں میں

اسعد بدایونی

مرا ہی خون چمکتا تھا اس کی آنکھوں میں
وہ دیوتا تو مجھے بھی گنہگار لگا

رفیق راز

شعری تخلیقات کے علاوہ جن ادباء کے تنقیدی مضامین اور نثری تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے ان میں جگن ناتھ آزاد، شمس الرحمٰن فاروقی، قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی، سلام بن رزاق، عابد پشاوری، حامدی کاشمیری، پروفیسر اسداللہ وانی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر منظر اعظمی، فاروق مضطر اور احمد یوسف وغیرہ شامل ہیں۔

پہلے شمارے میں سب سے پہلا بلراج کومل کا تنقیدی مضمون ''جدید ادب ایک رویہ'' شامل ہے۔اس میں انہوں نے جدید ادب کے مفہوم پر گفتگو کی ہے اور مختلف ناقدین ادب کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

''کیا ہم سب محفوظ ہیں؟''

اس سوال سے گفتگو کا آغاز کیا ہے اور آخر میں بتایا کہ جدید ادب وجودیت پر بات کرتا ہے اور انسان کے اندر موجود جذبۂ جستجو کا صحیح ترجمان جدید ادب ہے۔وہ لکھتے ہیں؛

> ''جدید ادب انسانوں کے جانے پہچانے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کی وساطت سے وجود کے مسئلے پر اپنی توجہ مرکوز کرنے پر مجبور ہے کیونکہ انسان نے کرۂ ارض سے بہتر کوئی دنیا ابھی تک دریافت نہیں کیا۔جدید ادب انسان کے جذبۂ جستجو کا بہترین آئینہ ہے۔''

حامدی کاشمیری کا مضمون ''نئی حسیت کا مفہوم'' کافی علمی ہے اور نئے دور کے ادب کی حسیت کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ادب کے شائقین اور اسکالروں کے لئے کافی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ادیب یا شاعر اپنے سماج کا باشعور، نفیس اور نمائندہ فرد ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں اس کے عہد کے خارجی حالات کا ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔فنکار اپنی الگ پہچان رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے رجحانات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔اس مضمون میں اس سوال پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے کہ ''عصری زندگی میں نئی ادبی حسیت یا شعور کیا ہے؟''۔ انہوں نے مختلف دانشوروں فرائڈ، ڈارون، ٹرپلنگ، ویلس فولی وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے۔آخر میں وہ یوں لکھتے ہیں؛

> ''آخر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عصری حسیت ہر نئے دور کی طرح چند گنے چنے دیدہ وروں کے حصے میں آتی ہے اور روایت زدہ لوگ اس کے اظہارات کو ناقابلِ فہم پا کر بوکھلاہٹ

اور حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اس کا درک حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو بہت دیر سے"۔

دھنک کے شمارہ نمبر 6 میں آل احمد سرور کا مقالہ ادب میں جدیدیت کا مفہوم شامل ہے جس میں انہوں نے تفصیل سے جدیدیت کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔

الغرض جدید ادب سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے دھنک کے شماروں کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے ان گنت رسائل و جرائد مسلسل شائع ہو رہے ہیں لیکن ان میں سے اکثر صرف اور صرف خانہ پوری کا شکار ہیں۔ کسی بھی ادبی رسالہ کا اجرا کرنے اور اسے منظرِ عام پر لانے سے زیادہ اہم اور مشکل ترین کام اسے زیادہ سے زیادہ معیاری بنانا اور پھر اس کے معیار کو قائم رکھنا ہے۔ دھنک کے شائع شدہ شماروں کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدیرِ رسالہ شروع سے ہی اس کے ادبی مزاج کو بلند تر اور معیاری سے معیاری بنانے کے لئے کوشاں ہیں اور اپنے اصول و ضوابط پر عمل پیرا ہیں۔ اس کے مختلف شماروں میں شامل کی گئی نگارشات و تخلیقات اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ دھنک کا آغاز جموں و کشمیر میں جدیدیت کی لہر کو عام کرنے کی غرض سے ہوا تھا اور یہ کوشش کامیابی کی منزلوں سے بھی ہمکنار ہوئی، نئے لوگ منظرِ عام پر آئے اور اپنی تخلیقی، علمی و ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے ادبی افق پر چھا گئے۔ بقول پرکاش فکری؛

"دھنک کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مزاج قطعی واضح ہے"

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دھنک بلاشبہ وہ رجحان ساز علمی و ادبی مجلّہ ہے جس نے جموں و کشمیر میں جدیدیت کی شمع روشن کی اور اس نظریہ کو فروغ بخشا، اس کے علاوہ یہاں کے متعدد قلمکاروں کو جدید اسلوب، آہنگ اور طرزِ بیان اپنا کر نئے دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید ادب تخلیق کرنے کی طرف راغب کیا۔ جموں و کشمیر میں ادبی صحافت کی تاریخ دھنک کا ذکر کئے بغیر ہرگز مکمل نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

سلیم طالب جموں وکشمیر Mob: 9086725034

# دعا

قاسم الدین پسوال تنہا
کنگن گاندربل کشمیر

سن لے پکار میری اے آسمان والے
عالی ہے شان تیری اے آسمان والے

حالات کا ہوں مارا، قسمت سے بھی میں ہارا
اب کر دے دستگیری اے آسمان والے

دریائے زندگی میں موجیں ہیں غم کی برپا
لہریں تھما دے غم کی اے آسمان والے

ہے آس مجھ کو تجھ سے حالت بدل دے میری
ہے تیرے کن کی دیری اے آسمان والے

بس تیرا اک اشارہ بدلے گا میری قسمت
رحمت ہوئی جو تیری اے آسمان والے

Mob: 7889668128

# مجھے کتابوں سے بچاؤ

محمد اسد اللہ

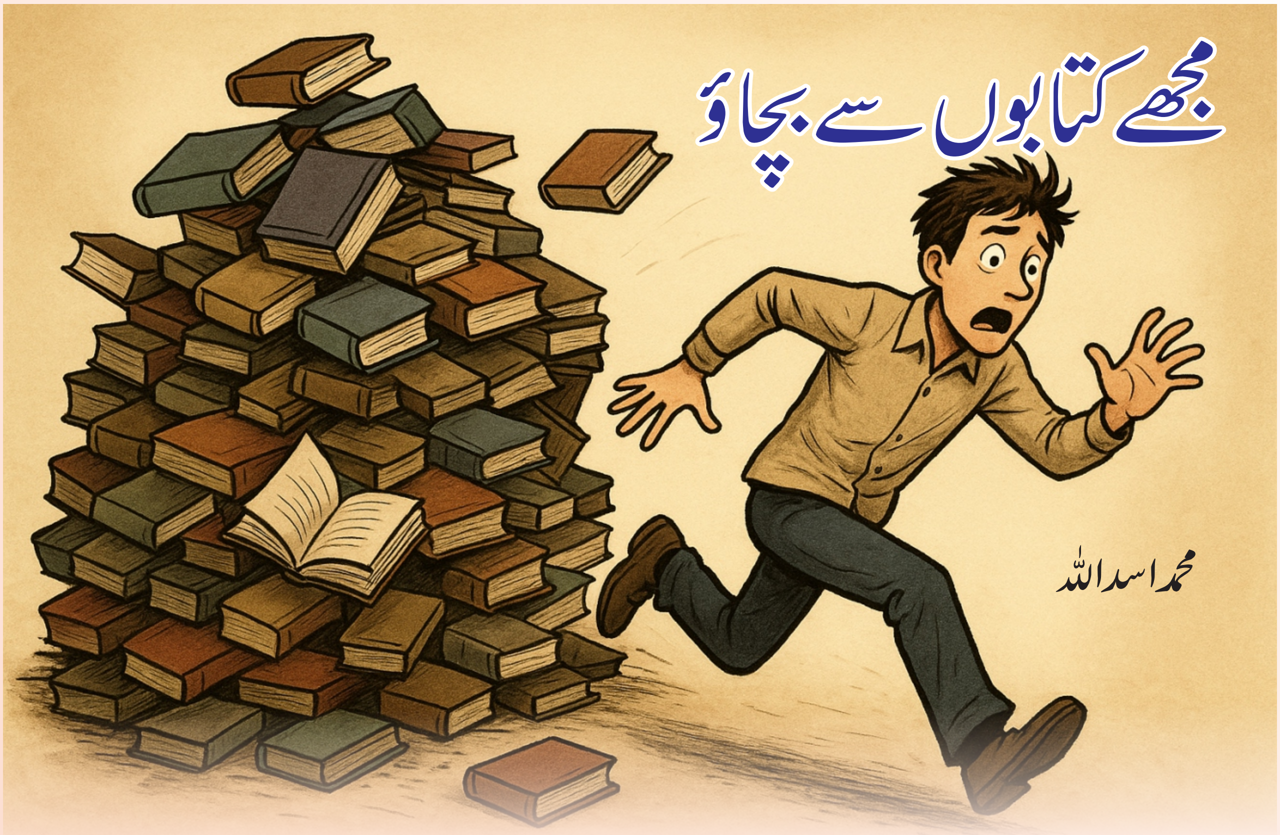

دنیا میں بے شمار آفتیں، بلائیں اور مصیبتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے کچھ زمینی ہیں کچھ آسمانی۔ ان سے بچاؤ کی خاطر ہم رات دن دعائیں مانگتے ہیں۔ بلاؤں کی اس قطار میں طوفان، زلزلے، اور فسادات ہیں، اس میں نصف بہتر بھی کھڑی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آخر الذکر، اول الذکر تمام مصیبتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیگم کو ارضی و سماوی دونوں قسم کی بلاؤں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ مشہور ہے:

رشتے آسمانوں میں بنتے ہیں اور مرزا غالب؟ کا یہ مصرع بھی موصوفہ ہی کی شان میں ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مصائب کی اس فہرست میں یقیناً کہیں بھی کتابوں کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ہم کیوں کتابوں سے پناہ مانگ رہے ہیں؟

کتابوں کی اشاعت سے متعلق موجودہ صورتِ حال سے اگر آپ واقف ہیں تو یہ جانتے ہوں گے کہ آسمانی کتابوں کے منکریں کے علاوہ زمینی کتابوں سے بیزار لوگوں کا بھی ایک بڑا طبقہ روئے زمیں پر موجود ہے۔ یقیناً کتابیں علم کا خزانہ ہیں اور نعمت کہلاتی ہیں، تاہم وقت اور انسانوں کو بدلتے اور رحمتوں کو زحمتوں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ یہی کچھ فی زمانہ کتابوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا اردو کے کسی نامور محقق کا ایک بیان ہم نے کسی رسالے میں پڑھا (پھر چند دیگر ادیبوں نے بھی اس بیان کو دہرادیا) بہر حال اس محقق نے اپنے مداحوں اور دوستوں سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تحفتاً انھیں اپنی کتابیں نہ بھجوائیں کیونکہ اب ان کے گھر میں کتابیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔ یہ پڑھ کر اس صاحبِ علم کے بارے میں ہمارے نیک خیالات اور خوش فہمیوں کے سارے قلعے مسمار ہو گئے بلکہ غصّہ بھی آیا کہ جس زبان نے انھیں یہ مرتبہ عطا کیا اس کی کتابوں کی ایسی تحقیر!

کل جس صورتِ حال کو ہم قابلِ نفریں سمجھتے تھے وقت نے ہمیں ان ہی حالات میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ مذکورہ محقق کے نظریاتِ بد میں آج ہم خود کو گھرا ہوا پاتے ہیں۔ ہم اب کتابوں سے اسی طرح بیزار ہیں جیسے کوئی مفلس کثرتِ اولاد سے پریشان ہو جاتا ہے اور ہم اس پریشانی کی واحد مثال نہیں ہیں، بے شمار مل جائیں گے، خاص طور پر ادیب اور شاعر۔

ادیبوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کتابوں کے درمیان جنم لیتے ہیں اور پھر کتابیں ان سے تولّد ہونے لگتی ہیں۔تخلیقات کو اولادِ معنوی کہا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ دور کی اکثر تخلیقات میں معنویت مفقود ہے اور اولادیت باقی رہ گئی ہے۔ کبھی یہی معنویت کتابوں کو گھر میں سینت سنبھال کر رکھنے کا جواز تھی اب کتابوں کا پھیلتا ہوا مادی وجود انھیں گھر سے چلتا کرنے کا سبب ہے۔اب اکثر لوگ اپنے گھروں میں کتابیں سجا کر مہذب اور تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، ظاہر ہے ڈگریاں تو کتابوں ہی کی مدد سے حاصل کی جاتی ہیں۔ ہمارے ایک شناسا خود کو ادیب ثابت کرنے کے لیے ان ہی کتابوں کو محبوب کی زلفوں کی طرح گھر بھر میں بکھرا کر رکھتے ہیں۔ کوئی ادیب ،ناقد یا محقق اگر واقعی ادبی کام انجام دے رہا ہے تو اس کی الماریوں میں کتابیں دھول کھاتی پڑی نہیں رہ سکتیں اور نہ انھیں سجانے کا اسے ہوش رہ پاتا ہے۔ کتابوں کی تزئین کاری ہوش والوں ہی کا کمال ہے۔

بھلا ہو اردو اکادمیوں کا اور سرکاری اداروں کا جن کی فیاضیوں کے طفیل ہماری کتابیں دھڑا دھڑ چھپ کر آنے لگیں تو ایسا لگا ہمارا غریب خانہ، ہمارا گھر نہیں رہا' کتاب گھر'
بن گیا ہے۔شروع شروع میں ہمیں یہ شکایت رہی کہ کتابیں تو چھپ گئیں مگر ادبی دنیا نے انھیں نظر بھر کر دیکھا تک نہیں مگر جلد ہی نظر انداز کئے جانے کا یہ گلہ جاتا رہا کہ اب کتابیں گھر والوں کی نظر میں آنے لگی تھیں بلکہ کھٹکنے لگی تھیں۔ مذکورہ تصانیف دوائے دل تو تھی نہیں کہ کاروبار آگے بڑھتا ،شومیِ قسمت سے سرمہ مفت نظر ثابت ہوئیں۔ ہم نے کسی سے ان کے فروخت نہ ہونے کا ذکر کیا تو کہنے لگے: جناب ان کا ولیمہ کروائیے، دھوم دھام سے رسمِ اجراء □ کا جشن منائیے۔ایک ہی کتاب کا کئی شہروں میں، 'مکرر ارشاد ہے' کہہ کر اجرا دہرائیے۔شہر کے ادب نواز موٹے مرغوں کو پکڑیئے۔کتاب بیچنے کے کئی شریفانہ طریقے ہیں۔صرف اچھا ادیب ہونا کافی نہیں ہے، اسے اچھا بزنس مین ہونا چاہئیے ورنہ ایسا آدمی وقت گزرنے پر ادیب بھی نہیں رہ پاتا، آثارِ قدیمہ بن جاتا ہے۔ جنابِ عالی آپ تو کتاب چھپوا کر اپنے منھ میں دہی جما کر بیٹھ گئے۔ادب کے کاروبار میں ایسے رنگ نہیں چڑھتا' لو دھی لو دھی' کہہ کر پھیری والے کی طرح اسے بیچنا پڑتا ہے۔ اگر آپ بذاتِ خود اپنی کتاب کی شان میں ایک جملہ بھی کہیں گے تو ادب کے وہ چرب زبان ستون جو دوسروں سے اپنی تصانیف پر تھوک کے بھاؤ سے مضامین لکھوا کر چھپواتے ہیں، آپ کے سر پر خود ستائی کا الزام لگا کر ستانے سے باز نہ آئیں گے۔ ان کی اس حرکت میں یہ پیغام چھپا ہے کہ آپ بھی دوسروں سے یا دوستوں کے نام سے اپنی اور کتاب کی شان میں قصیدے لکھوا کر دنیا کو بتائیے کہ اب اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرہ۔

بد قسمتی سے ہم بھی ادیب ہیں اور چند دوستوں کے اصرار پر ان کی کتابوں پر تبصرے چھپوانے کی خطا کر بیٹھے چنانچہ اب کئی ادیبوں کا تقاضا ہے کہ ہم ان کی ہر کتاب پر ایک مضمون یا تبصرہ لکھیں۔ اسی دوران ایک مقامی رسالے کے ایڈیٹر نے ہمیں پکڑا کہ کوئی مبصر نہیں مل رہا ہے یہ کہہ کر یہ ذمہ داری اور کتابوں کا ایک بنڈل تھما دیا۔ستم ظریفی یہ کہ جن ادیبوں کی وہ کتابیں تھیں ان کو خبر ملتے ہیں انھوں نے بھی اپنی نہ صرف تازہ تصنیف بلکہ پچھلی تمام کتابیں بھجوادیں کہ ان کی روشنی میں کچھ لکھو۔انھیں کیسے سمجھاتے کہ ہمارا دولت کدہ پہلے ہی تجلی زار بنا ہوا ہے۔ ہمارے گھر میں ہماری اپنی ڈیڑھ درجن کتابوں کے بنڈلوں کے علاوہ ہمارے شوقِ مطالعہ کا حاصل کتابیں اور قلم کاروں اور دوستوں کی سوغاتیں،غرض سارا گھر کتابوں سے بھر گیا۔گھر والے اس طوفانِ ادب سے گھبرا گئے۔

ہم نے جب مکان تعمیر کیا تھا تو اس نیک کام کے دوران یہ بھلا بیٹھے کہ

ہمارے اندر کتابوں کے مطالعے کا شوقین شخص اور ایک ادیب بھی تشریف فرما ہے۔ عام لوگوں کی طرح ہم نے گھر میں کتابوں کا کوئی کمرہ نہیں رکھا۔ وقت کے ساتھ جب گھر کے مکین پھولنے پھلنے لگے تو ہمارا مکان اس قدر سکڑتا ہوا محسوس ہونے لگا کہ اس کا 'گھرپن' خطرے میں گھر گیا۔ تب ہم نے کچھ کرنے کی ٹھانی۔ کسی نہ کسی چیز کو تو دیس نکالا دینا ہی تھا؛ نظرِ انتخاب سب سے پہلے کتابوں پر پڑی، بلکہ لگتا ہے وہ پہلے ہی سے نظر میں تھیں، بس کھٹکنے کا عمل ذرا دیر میں شروع ہوا۔ اب جوان کتابوں پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ کتابیں پورے گھر میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں جیسے کسی ملک میں بے کاری اور بے روزگاری پھیل جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کتابوں کا اپنا کوئی ملک یعنی کمرہ نہیں تھا جہاں کی شہریت انھیں حاصل ہوتی۔ وہ مختلف کمروں مثلاً ڈرائنگ روم، بیڈروم، اسٹورروم، حتیٰ کہ کچن (کوکنگ سے متعلق کتابیں )اور گاہے بگاہے ڈائننگ روم کے ٹیبل پر بھی پڑی ہوئی پائی جاتی تھیں۔ جہاں پڑھا وہیں چھوڑ دیا گیا۔

بیوی کے لیے تو خیر ان کی حیثیت سوتن کی تھی، مگر گھر کے دیگر افراد کے ٹھکانوں پر بھی کتابوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ ہر چند ہم ہر دو چار ماہ بعد پڑھی ہوئی یا فضول کتابوں کو چور اچکوں اور اٹھائی گیروں کی طرح پکڑ پکڑ کر شہر کی لائبریری کے حوالے کر آتے تھے۔ ایک سست قسم کے لائبریرین نے تو ایک مرتبہ ہمیں سخت سست بھی کہہ ڈالا۔ اس کا یہ جملہ اب تک یاد ہے کہ 'جناب! لوگ لائبریری میں کتابیں لینے آتے ہیں اور آپ کتابیں دینے۔' بات در اصل یہ تھی کہ ہمارے اس لینے کے دینے پڑ جانے پر اس کا کام بڑھ جاتا تھا، رجسٹر میں کتابوں کی انٹری جو کرنی پڑتی تھی۔

کتابوں کو لائبریریوں اور ضرورت منداور غیرضرورتمند دوستوں کے حوالے کر کے ہم اکثر خود کو احساسِ جرم کا شکار پاتے ہیں۔ یہ احساس ایسا ہی ہے جو ان باضمیر یا سست ضمیر لوگوں کو ہوا کرتا ہے جو اپنے بوڑھے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ آتے ہیں۔ کبھی کتابیں ہماری سوجھ بوجھ اور دانشمندی کی مائی باپ تھیں اب ان کتابوں کا کوئی مائی باپ نہیں ہے۔

ہم کتابوں کے مجرم ہیں اس لیے کہ ہم انھیں چھپواتے ہیں؛ خریدتے ہیں، بیچتے ہیں، ان کے پی ڈی ایف جمع کر کے یا انھیں الماریوں میں سجا کر اور لوگوں کو ان کی تعداد بتا کر ان پر رعب جماتے ہیں، کتابوں سے شہرت پاتے ہیں، ان کی مدد سے ملازمت اور عہدے حاصل کرتے ہیں، انھیں اونچی ایڑی

کی سنڈل بنا کر پہنتے ہیں اور خود کو سماج میں اونچا اٹھاتے ہیں، ان کی مدد سے لوگوں کو نیچا دکھاتے ہیں، مگر انھیں پڑھتے نہیں یا کم پڑھتے ہیں اور زیادہ بتاتے ہیں۔ کتابوں کا ہم پر یہ حق ہے کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ ہم یہ حق ادا نہ کر کے ان کے مجرم ہیں مگر یہاں معاملہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا ہے۔ میں جب بھی کتابوں کو الماریوں میں دیکھتا ہوں

(خواہ کسی کی ذاتی ملکیت ہو یا عوامی لائبریری کی) مجھے محسوس ہوتا ہے؛ الماری میں کتابیں نہیں جیل کے اندر قطار میں بیٹھے ہوئے مجرم ہیں۔

ہم پر کتابوں کا یہ حق ہے کہ انھیں پڑھا جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم یہ حق ادا نہیں کرتے بلکہ بعض لکھنے والے بھی اس کارِ فضول سے جان چراتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوران گفتگو ایک نوخیز، ابھرتے ہوئے، بلکہ اچھلتے ہوئے ادیب نے اپنی گردن ٹیڑھی کر کے یہ بتایا کہ وہ پڑھتے نہیں صرف لکھتے ہیں۔ ہم نے وجہ جاننے کی کوشش کی تو فرمانے لگے، دوسروں کی کتابیں پڑھنے سے ہمارا رائٹنگ اسٹائیل خراب ہوتا ہے۔ ہم نے کہا: بڑے ادیبوں کی تصانیف کے مطالعے میں تو یہ خطرہ نہیں ہے۔ کہنے لگے ایک دو مرتبہ کوشش کی تھی مگر میرے اندر احساسِ کمتری پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ بھلا ایک رائٹر میں اعتماد کی کمی پیدا ہو جائے تو وہ کیسے لکھے گا۔

یہ تو ایک ادیب کی رائے تھی، کسی حد تک صحیح بھی تھی کہ گھٹیا کتابیں یقیناً ہمارے ذوق کو متاثر کرتی ہیں۔ عام طور پر ہم کتابیں پڑھتے ہیں نہ اوروں کو پڑھنے دیتے ہیں کہ اچھی کتابیں ہمیں جینے کی جو راہ بتاتی ہیں، ہم اس پر چلنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم نے اپنے الگ راستے بنا رکھے ہیں، پھر ان پر کون چلے گا۔ میں جب کبھی الماریوں کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی عمدہ اور عظیم کتابوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہمیں اس قید خانے سے باہر نکالو، ہمیں بھی اپنی زندگی کے سفر میں شریک کرلو اور کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو ان کتابوں کی جگہ قید کر دوں اور ان کتابوں کو وہاں سے آزاد کر کے سماج، سیاست، ادب، مذہب اور تعلیم و تدریس وغیرہ کے سب میدان ان اچھی اچھی کتابوں کے حوالے کر دوں کہ، لو، زندگی کے سارے شعبے اب تم سنبھالو! ہم نے تو ہر جگہ کھیل بگاڑنے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں۔

عام آدمی کا کتابوں سے کبھی نہ کبھی ایک تعلق ضرور ہوا کرتا ہے خواہ درسی کتابوں کی صورت میں ہو یا بینک کے پاس بک کی شکل میں۔ ہم ٹھہرے ادیب۔ کتابیں ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ (ہم انھیں بچھاتے ہیں اور لوگ اوڑھتے ہیں؟، اوڑھی ہوئی چیزوں کو اتار پھینکنا کس قدر آسان ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں) دراصل مکان کی تعمیر کے وقت یہ قطعی خیال نہ آیا کہ زندگی کے اس سفر میں کتابیں بھی ہماری ہم سفر ہیں اور ضروریاتِ زندگی کا حصہ ہیں۔ ہمارے گھروں میں مرغیوں، کبوتروں، بکریوں، کتوں اور دیگر جانوروں کی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے لیے ایک کمرہ بنانے کا خیال تک نہیں آتا، شاید اس لیے کہ کتابیں بے جان چیزیں ہیں۔ وہ تو چھپکلیوں، مکڑیوں، مچھروں، کاکروچ اور چیونٹیوں کی طرح گھر کے کسی کونے میں رہ سکتی ہیں۔

گذشتہ ماہ ایک صاحب نے جن سے ہماری جان نہ پہچان، کہیں سے ہمارا پتہ حاصل کر لیا اور کتابوں کا ایک بنڈل ہمارے نام داغ دیا۔ پہلے یہ مصیبت ایک فون کی شکل میں نازل ہوئی۔ کسی کوریئر سینٹر سے کال کر کے بتایا گیا کہ آپ علاقے میں ہماری خدمات معطل ہیں اس لیے اپنا پارسل آپ کو خود ہی ہمارے آفس سے لے جانا پڑے گا۔ اس ڈر سے کہ کوئی اہم چیز نہ ہو ہم ہفت خواں طے کر کے اس آفس پہنچے تو دیکھا اس بنڈل میں کسی نے اپنے سات شعری مجموعے بھجوا دئے تھے۔ کتابوں کی رسید کی اطلاع نہ دینا بداخلاقی ہے یہ سوچ کر ہم نے انھیں فون کیا تو ادھر سے حکم صادر ہوا کہ جناب اب ان کتابوں پر تبصرے بھی لکھ دیجئے۔ ہم نے تنگ آ کر وہ کتابیں کسی نیکی کی طرح ایک مقامی لائبیریری کے دریا میں ڈال دیں اور اب ہم اسی نامور محقق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ خدا کے لیے ہمیں کتابیں نہ بھجوائیں کیونکہ اب کتابوں کے لیے اب صرف ہمارے دل میں جگہ بچی ہے، گھر میں نہیں ہے اور جو کتابیں ہمیں عزیز ہیں ان کے پی ڈی ایف ہم نے موبائیل اور کمپیوٹر کے دل میں ناکام حسرتوں کی طرح محفوظ کر رکھے ہیں۔

☆☆☆

---

محمد اسد اللہ، ۳۰، گلستان کالونی، ناگپور، (مہاراشٹر) ۳۱۰۰۴۴

رئیس احمد کمار

# پرویز شہریار کے نظموں کا مجموعہ "امن کی تلاش میں"

پرویز شہریار تحقیق، تنقید، افسانہ نگاری اور شاعری کی دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے جن کا زکر نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے ادبی حلقوں میں اکثر گفتگو کے دوران ہوتا رہتا ہیں۔ جمشید پور میں پیدا ہونے والے اس ادبی سپوت نے اپنا ادبی سفر اسی کی دہائی میں شروع کیا ہے۔ وہ درجنوں تصانیف کے خالق ہیں جن میں نظموں کے مجموعے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی افسانوی مجموعے بھی اردو ادب کی نظر کئے ہیں۔ بڑے شہر کا خواب، شجر ممنوعہ کی چاہ میں، منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور، بڑا شہر اور تنہا آدمی، پرویز شہریار کی خاص تصانیف میں شمار ہوتے ہیں۔ امن کی تلاش میں، ان کی حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ایک خاص تصنیف ہے جو Star Creative Publications، Delhi کے زریعے شائع کرائی گئی ہے۔ یہ کتاب 256 صفحات پر محیط ہے جس میں کل بیاسی نظمیں شامل ہیں۔ مصنف نے یہ تخلیق اپنے دو اساتذہ صاحبان پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر صادق کے نام کی ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر چار پر پرویز شہریار کے لیے ایک نظم قارئین کے نظروں سے گزرتی ہے جو نجمہ منصور نے لکھی ہے۔ گمشدہ آدمیت کی متلاشی نظمیں، عنوان کے تحت ایک طویل مضمون جو گیارہ صفحات پر محیط ہے، سعادت سعید نے رقم کیا ہے، دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ بقول ان کے پرویز شہریار نے صاف، سادہ اور شستہ اردو میں اپنے دل کی باتیں کیں ہے۔ انہوں نے اردو فکشن کو ہی بطور خاص تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ پرویز شہریار نے "چمبل کی دسویں رانی" کے طور پر پہلی تخلیق کو جنم دیا ہے جب وہ محض دسویں جماعت کا طالب علم تھا جو ہفت روزہ پندار پٹنہ میں شائع ہوئی تھی۔ آدم اور حوا اور انتظار کے دوش پر، ان کی اولین نظمیں ہیں جو اخبار مشرق میں شائع ہوئیں ہیں۔

ہم امن چاہتے ہیں، یہ اس تصنیف میں شامل پہلی نظم ہے۔ امن کا متلاشی، مصنف کرہ ارض پر رہنے والے ہر اس فرد کو باور کرانا چاہتا ہے کہ جنگ ہی مسائل کا حل نہیں ہے۔ آخر کب تک اس دھرتی پر بے امنی کا ماحول راج کرتا رہے گا۔ موجودہ دور کے جدید انسان سے سوال پوچھتا ہے کہ تم نے ہی دنیا کو تہزیب و تمدن دیا تھا اور ویران صحراوں کو چمن زار بنایا تھا مگر آج کل ایسا لگتا ہے کہ تمہاری عقل ہی کھو گئی ہے۔ مشیت ایزدی، فلسطین کی بگھڑتی ہوئی صورتحال کو موضوع بنا کر اس نظم کو تخلیق کیا گیا ہے۔ وہاں کی ناگفتہ بہ حالات اور عورتوں، عمر رسیدہ لوگوں حتا کہ بچوں کی چیخ و پکار کو آواز دینے کی

بھر پور کوشش ہوئی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ مردہ ضمیر حکمران اور خود کو عبادت گزار مسلمان جتلانے والے لوگ خاموش تماشائی بن کر بیٹھے ہیں۔ مابعد جدید مسلمان، اس نظم کے زریعے شاعر نے مسلمانان عالم سے بیزار ہو کر انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ہے جو نہ نماز کے عادی بن جاتے ہیں، نہ عورتوں کو باپردہ دیکھنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں نماز کے لئے دی جانے والی ازانیں راغب کرتیں ہیں بلکہ وہ جدیدیت میں ڈوبے نظر آتے ہیں اور خود کی اور معاشرے کی فکر انہیں بالکل بھی نہیں ستاتی ہے۔ احتجاج کی نظم، اس خوبصورت نظم کے زریعے شاعر نے موجودہ دور کے صورتحال کی عکاسی کی ہے، جہاں انسانوں کی نسل کشی بلا کسی روک ٹوک کے جاری ہے۔ مصنف کو حیرت اس بات پر ہے کہ ظالموں میں اتحاد ہے، مظلوموں میں نفاق پیوست ہے اور وہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو؟ ہیں اور اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی بیٹھ کر یہ سارا اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ فوجی، بے گناہ اور بے قصور افراد کا قتل عام کس طرح ایک وردی پوش فوجی کی زریعے انجام دلوایا جاتا ہے اس نظم کا موضوع بنایا گیا ہے۔ لاک ڈاؤن اور مزدوروں کا کاروبار، کرونا وائرس کے دوران پیش آنے والے مشکلات کا احاطہ اس نظم کے زریعے کیا گیا ہے۔ مزدور طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا جن کو اپنے اور اپنے اہل عیال کے لیے دو وقت کی روٹی ممکن بنانا بالکل مشکل اور کٹھن ثابت ہو رہا تھا اور سارے لوگ بے بسی کے عالم میں موت کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ان دنوں اس وباء سے بچنا کسی معجزے سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھوک کی حمایت میں، بھوک انسان کی فطرت میں ہے مگر جب بھوک حد پار کرتی ہے تو انسان کو کیا کرواتی ہے تمام اصول وضوابط کی دھجیاں اڑانے پر مجبور کرتی ہے۔ آدم اور حوا کو بھی بہشت

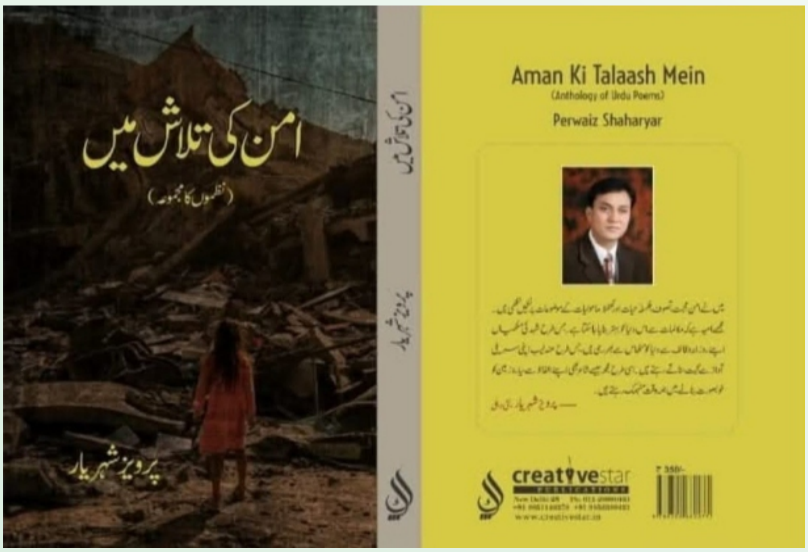


سے بھوک نے ہی نکلوایا تھا۔ ارتقائے محبت، قران مجید کی سورہ روم میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ کس طرح آدم کو راحت اور سکون قلب پہنچانے کے لئے حوا کو اسی کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور ان کے درمیان محبت کو ایک ٹھوس ستون بنا دیا ہے۔ اسی موضوع پر اس نظم کو تخلیق کیا گیا ہے۔ ایک نظم تمہارے لئے، یہ ایک منفرد اور الگ قسم کی نظم ہے جس میں رومانوی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ عورت پر ایک نظم، بقول شاعر عورت اور جنگ سے ہی دنیا ارتقاء پزیر ہوتی رہی ہے، عورتوں کی جدائی نے ہی دنیا کی عظیم نظموں کو جنم دیا ہے۔ محبت کیا ہے، محبت کی مختلف جہتیں اور معنی اس فلاسفکل نظم سے جھلکتی ہیں۔ بقول شاعر محبت ہی ایک انسان کو انسان سے جوڑتا ہے جو صرف انسان کو ہی خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یہ ایک انمول تحفہ ہے جس کی وجہ سے اس دھرتی پر انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اس نے پوچھا، شاعر کو اپنے کسی دوست نے کبھی پوچھا تھا کہ یہ نظم اس نے کب لکھی ہے۔ جواباً وہ اسے کہتا ہے کہ ایک شاعر کبھی زمان ومکان کے دائرے میں مقید نہیں رہتا ہے۔ یہ وہ مخلوق ہیں جو ہنستے ہوئے روتے ہیں اور روتے ہوئے ہنستے ہیں۔ بقول شاعر، ایک شاعر ناقد کی منطق سے نہیں بلکہ اپنی منطق سے لکھا کرتے ہیں۔ جسم کے رشتے ہیں سچے، اس نظم میں جسمانی محبت کو سچا دکھا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دو جان کس قدر بھی جدا ہو جائیں ان میں محبت کی چاشنی کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ جدائی ختم ہونے پر وہ پھر سے ایک دوسرے کے بہت قریب آتے ہیں اور گلے لگ جاتے ہیں۔ الہامی نظمیں، شاعر اس نظم میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کی بعض نظمیں الہامی ہیں انہیں سطحی طور سے دیکھنا بڑی نادانی ہوگی بلکہ ایک سچا ادیب اور پارکھی ہی سمجھ سکتا ہے۔ فراموش کیجئے، اس نظم میں انسانیت کو ایک موثر نصیحت اور سبق دیا گیا ہے کہ کس طرح ہمیں انا میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے، نفس کی غلامی چھوڑنی چاہئے اور صوفی سنتوں کی

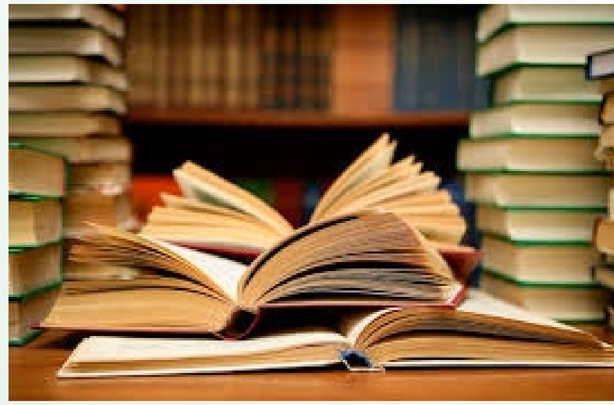

تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ دختر مشرق، مشرقی عورتوں کے حوصلوں، جزبوں اور ہنرمندی کو سلام پیش کرتے ہوئے شاعر قاری کے ذہن میں یہ سچائی پیوست کرانا چاہتا ہے کہ مشرقی عورت اپنوں کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی نہیں کتراتی ہے، اندر سے دکھی رہ کر بھی وہ ہر دم مسکراتی رہتی ہے اور مائیکے سے سسرال کی باتیں اور سسرال سے مائیکے کی باتیں کمال فن سے چھپاتی ہیں۔ قدرت کا حسین شہکار، عورت کی خوبیوں کو گردانتے ہوئے یہ نظم تخلیق کی گئی ہے جس کی آنکھیں پرکشش ہوتی ہیں، جس کی بانہیں چمکدار ہوتی ہے اور قدرت کا ایک شہکار ہوتی ہے۔ بقول شاعر، اسی کے وجود سے رو? زمین ہر دم بہار رہتی ہے۔ گلیشیر پگھل رہے ہیں، عالمی اوسط درجہ حرارت میں گزشتہ کئی سالوں سے بتدریج اضافہ درج کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے نہ صرف کرہ ارض کا آب و ہوا ہی تبدیل ہو گیا ہے بلکہ ہمارے اونچے پہاڑوں پر صدیوں سے موجود گلیشئر بھی پگھل رہے ہیں۔ یہ ایک تشویش ناک صورتحال ہے جسے پرویز شہریار نے نظم کے زریعے بیان کیا ہے۔ شاعر بحیثیت ایک اینوائرونمنٹ ایکٹیوسٹ اس وجہ سے پریشان لگ رہا ہے اور فوری علاج چاہتا ہے تاکہ زمین پر رہنے والے لوگ اور دیگر حیوانات پانی کی کمی محسوس نہ کریں۔ اس کتاب میں شامل تمام نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جن میں شاعر نے اپنے احساسات، کرب، درد اور مشاہدات کو صفحہ قرطاس پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

☆☆☆

رئیس احمد کمار　قاضی گنڈ کشمیر

# نظم

سیدہ سعدیہ فتح

## عہد وفا

جب جب دیش میں آزادی کا پرچم ہم لہرائیں گے
دیش پہ جان لٹانے والے یاد بہت ہی آئیں گے

وطن عزیز میں جب بھی دشمن اپنا جال بچھائیں گے
ہم اپنے اسلاف کی طرح ان کو سبق سکھائیں گے

دیش بھگت کی آڑ میں جو نفرت کی بیج لگائیں گے
ہم بھارت کے واسی ہیں 'مل کر ان سے ٹکرائیں گے

خون خرابا کرکے جس نے دھرتی کو رسوا ہے کیا
ان فاسد جابر لوگوں کو ایسا مزہ چکھائیں گے

ماں بہنوں کی روند دی عزت بیٹی کو عریاں بھی کیا
ایسے ظالم وحشی درندوں کو سولی چڑھائیں گے

اس گلشن کو جانبازوں نے اپنے لہو سے سینچا ہے
ہم سب پیار محبت سے ایکتا کے پھول کھلائیں گے

اپنے وطن کے آنگن میں الفت کی شمع جلائیں گے
گیت وفا کے گا کر ہم خوشیوں کا سماں بنائیں گے

کولکاتہ (انڈیا)
موبائل نمبر 8444812292

# ’’کارنامہ منیر لاہوری‘‘ اور ’’سراج منیر‘‘

## کی

# تنقیدی ارزش و اہمیت


تلخیص:

( فارسی زبان وادب میں ادبی تنقید نگاری کا باقاعدہ آغاز مغربی زبانوں کی تنقید نگاری کے مقابلے میں بہت بعد میں ہوا تھا اور اس کو باضابطہ طور پر ایک ادبی صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے کا سہرا اہل زبان یعنی ایرانیوں کے نہیں بلکہ شبہ قارہ ہندو پاک کے فارسی گو ادیبوں اور شاعروں کے سر رہا ہے حالانکہ اس بات سے تو انکار ممکن نہیں ہے کہ اہل زبان کے یہاں قدیم زمانے ہی سے شعر و شاعری کا ایک وافر ذخیرہ موجود رہا با این ہمہ، فارسی ادب میں فن نقد سے متعلق مواد نہ ہونے کے برابر نظر آتا ہے، فارسی ادب میں فن نقد کی تحریری شروعات ملا منیرؔ لاہوری کے رسالے ’’کارنامہ‘‘ سے ہوتی ہے حالانکہ اس رسالے کو تحریر کیے جانے سے قبل بھی یہاں کے سخنوروں کی طرف سے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا جاتا رہا تھا لیکن یہ اظہار نظر، صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود تھا لوگ اس کو تحریری شکل میں محفوظ کرنا ضروری خیال نہیں کرتے تھے لیکن جب ایرانی دانشوروں نے اپنی زباندانی کے زعم میں اس دیار غیر کے دانشوروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو تمسخر و تضحیک کا بھی نشانہ بنایا گیا، لہٰذا اہل زبان کی طرف سے کی جانے والی اس ناانصافی کے سبب یہاں کے فارسی داں طبقے میں ایک بے چینی اور اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں کا لوہا منوانے اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے دن و رات ایک کر دیئے، کہ زبان کوئی بھی ہو، وہ کسی علاقے، ملک یا قوم کی میراث نہیں ہوتی، بلکہ غیر اہل زبان بھی اپنی محنت شاقہ اور مساعی جمیلہ سے دنیا کی کسی بھی زبان میں وہ ہی مہارت و مقام حاصل کر سکتے ہیں جو کہ اہل زبان کو حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ان دانشوران ادب نے اپنے جائز حقوق کو منوانے کے لیے باقاعدہ طور پر کتابیں تحریر کرنے کیں، اس سلسلے کی سب سے پہلی باقاعدہ، ادبی کوشش فارسی ادب کے عظیم شاعر اور جید عالم ابوالبرکات منیرؔ لاہوری نے کی انھوں نے اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ ’’کارنامہ‘‘ تحریر کیا اور سراج الدین علیخان آرزو جیسے قد آور فارسی گو عالم نے ’’سراج منیر‘‘ تحریر کر کے منیرؔ لاہوری کے قلم سے روشن کی گئی اس شمع کو مزید درخشندگی اور تابندگی عطا کی ان دونوں

ادیبوں کے عملی اقدامات کے بعد برصغیر کے فارسی گو دانشوروں نے ان کے نقش قدم پر چل کا ،صنف نقد کو ایسا عروج دوام عطا کیا کہ ان کے یہ کارنامے اہل زبان کے لیے بھی مورد تامل اور لائق تقلید بن گئے اور عصر حاضر میں جبکہ فارسی زبان وادب کا انتقادی سرمایہ بہت زیادہ بیش قیمت اور گرانقدر ہو چکا ہے لیکن جدید فارسی ناقدین آج بھی ہندو پاک کے دانشوروں کی تنقیدی کاوشوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں )

''کارنامہ منیر لاہوری'' اور ''سراج منیر'' فارسی ادبی نقد وانتقاد کی دنیا میں خصوصی اہمیت ومقبولیت کے حامل دو مختصر رسالے یا کتابچے کہے جاسکتے ہیں ان میں سے پہلا رسالہ یا کتابچہ ملا منیر لاہوری کا تصنیف کردہ ایک معرکتہ الآرا کارنامہ ہے جبکہ دوسرا رسالہ سراج الدین علی خاں آرزو کے قلم سے نکلا ہوا بہترین ادبی شاہکار ہے جو منیر لاہوری کے رسالے'' کارنامہ'' کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔منیر لاہوری گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ایک ہمہ جہت وہمہ گیر ادبی شخصیت شمار کیے جاتے ہیں انھیں فارسی نثر اور نظم دونوں پر کما حقہ دسترس حاصل تھی ،اس نابغہ روزگار شخصیت کی بے پناہ ادبی صلاحیتوں اور علمی لیاقتوں کا اعتراف ان کے معاصرین ہی نے نہیں بلکہ ان کے بعد کے فارسی داں دانشوروں نے بھی کیا ہے یوں تو اس نابغہ روزگا شخصیت کے ادبی کارناموں کی ایک طول وطویل فہرست ہے اور ان کے بیشتر منثور ومنظوم آثار اس جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر چکے ہیں لیکن فارسی ادبی نقد کے میدان میں بھی منیر لاہوری کی اہمیت وعظمت اپنی جگہ مسلم ہے، گو کہ اس عظیم دانشور نے براہ راست یا شعوری طور پر تو فن نقد سے متعلق کوئی خاص کارنامے انجام دینے کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ صرف نہیں کی ہے لیکن اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ فارسی زبان وادب میں نقد نویسی کی باقاعدہ اور باضابطہ ابتداء اسی یگانہ عصر شخصیت کی دانشورانہ اور ہوش مندانہ ادبی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ عہد شاہجہانی میں ہندوستانی درباروں میں اہل زبان یعنی ایرانیوں کا اثر ونفوذ بہت زیادہ بڑھ چکا تھا اور محض اہل زبان ہونے کی بنیاد پر ایرانی شاعروں اور ادیبوں کو مغل درباروں میں ہندوستانی دانشوروں سے زیادہ توفق وترجیح حاصل ہوتی تھی ،اور یہاں کے علماوشعراء کے فارسی تخلیقی کارناموں کی اہمیت وافادیت سے دانستہ طور پر چشم پوشی اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ، اس زمانے میں ایک عام خیال یہ تھا کہ فارسی ایرانیوں کی مادری زبان ہے اس لیے وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرسکتے اور یہ ہی سبب تھا جس کی وجہ سے ایرانیوں کے منثور ومنظوم کارناموں کو ہی زیادہ معتبر اور مستند تصور کیا جاتا تھا ،اور اس ملک کے فارسی گو سخنور ،خواہ وہ کتنے ہی باصلاحیت اور بالیاقت کیوں نہ ہوتے محض غیر اہل زبان ہونے کی بنا پر مغل درباروں میں انھیں وہ توقیر وتمجید حاصل نہیں ہوتی تھی جو ایرانیوں کو حاصل تھی اور ستم بالائے ستم تو یہ تھا کہ بعض اوقات شاہی درباروں میں ان عظیم تخلیق کاروں کے ساتھ غیر مساوی اور ہتک آمیز سلوک بھی روا سمجھا جاتا تھا جبکہ تاریخ شاہد ہے کہ سرزمین پاک وہند کی خاک میں ، فارسی زبان وادب کی بے لوث خدمت کرنے والوں کی وافر تعداد موجود رہی ہے جن کی عظمت وقابلیت کا اعتراف صرف ہم وطنوں نے ہی نہیں کیا ہے بلکہ خود اہل زبان بھی اپنے تمام تر ملی تعصب ،قومی توفق اور احساس برتری کے باوجود بھی ان کی تعریف وتوصیف کرنے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔مشہور ومعروف

ایرانی محقق اورادبی ناقد ڈاکٹر شہریار نقوی نے یہاں کے دانشوروں کے ناقابل فراموش ادبی کارناموں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ھندوپاکستان کے فارسی گو دانشوروں کی طرف سے اختیار کی گئیں ادبی و علمی مساعی جمیلہ کو تادیر یاد رکھا جائے گا وہ لکھتے ہیں:

’’اہتمامی کہ در کشور ہندوستان (بمعنی علم قدیم کہ شامل ھر دو مملکت ھندو پاکستان فعلی است نسبت زبان و ادبیات فارسی مخصوصاً در قسمت فرھنگ نویسی و تذکرۃ الشعراء مبذول شد، چندین برابر کاری است کہ خود ایرانیان در این بارہ انجام دادہ اند‘‘!

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ بہترین ادب آفاقی اہمیت وافادیت کا حامل ہوتا ہے خواہ وہ دنیا کی کسی بھی زبان، ملک، قوم یا علاقے سے تعلق رکھتا ہو اسے کسی مخصوص خطے، گروہ یا قوم کے ساتھ مخصوص ومحدود نہیں کیا جا سکتا ہے، برصغیر کے نامور شعراء اور ادباء مثلاً مسعود سعد سلمانؔ، ابوالفرجؔ رونی، امیر خسروؔ، حسن سجزیؔ، ابوالفضلؔ، فیضیؔ فیاضی اور منیرؔ لاہوری وغیرہ جیسے متعدد عظیم المرتبت اور نابغہ روزگار شخصیات کے علمی تبحر اور شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف ہر دور میں ہر فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے لیکن ان کے تمام علمی تبحر کے باوجود بھی مغل درباروں میں ان کو اہل زبان کے مساوی درجہ نہیں دیا جاتا تھا، جس کی وجہ سے یہاں کا فارسی داں حلقہ آہستہ آہستہ احساس کم تری اور ذہنی اضطراب میں مبتلا ہوتا چلا گیا اور انھیں اپنی ہی تخلیقی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے تئیں بدگمانی پیدا ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کوئی انفرادی کارنامے انجام دینے کے بجائے تقلیدی راہوں کو اختیار کرنے میں ہی اپنی خیر و عافیت تصور کرنے لگے انھوں نے اجتہاد کے راستے کو چھوڑ کر تقلید کی روش اختیار کی اور اہل زبان کے پیچھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہی اپنی کامیابی کا ضامن قرار دینے لگے، لیکن انھیں احساس کم تری میں مبتلا علما و فضلا کے گروہ میں کچھ ایسے باہوش و باشعور اہل علم بھی موجود تھے جو ایرانیوں کی بے جا احساس برتری کو بے چون وچرا قبول کر لینے پر ہرگز بھی تیار نہیں تھے ان حقیقت شناس مٹھی بھر لوگوں کی دوربین نگاہوں نے اس حقیقت کا احساس کر لیا تھا کہ صرف اہل زبان ہونے کی بنیاد پر کسی شاعر یا ادیب کو فوقیت یا ترجیح نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی کوئی ایرانی خواہ وہ کتنا ہی بڑا شاعر یا مصنف کیوں نہ ہو، اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا ہمہ کلام زبان کی لغزشوں اور اغلاط سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ زبان میں چھوٹی موٹی غلطیوں کا راہ پا جانا انسانی فطرت میں شامل ہے لہٰذا زبان و بیان کی غلطیاں اور لغزشیں تو کسی بھی شاعر اور ادیب سے سرزد ہو سکتی ہیں لیکن صرف غیر اہل زبان ہونے کی بنیاد پر یہاں کے دانشوروں کے تخلیقی کارناموں کی عظمت اور اہمیت کو نظر انداز کر دینا اور ان کے جائز مقام و مرتبہ سے انھیں محروم کر دینا ازروئے انصاف بالکل بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ تو عظیم فن کاروں پر ظلم کرنے کے مترادف ہے، کسی ایرانی شاعر یا ادیب کو صرف علاقائی یا اہل زبان ہونے کی بنیاد پر علمی اعتبار سے قابل اعتبار تصور کرنا عدل کے منافی ہے جو کسی بھی طور سے قابل قبول نہیں گردانا جا سکتا، لیکن افسوس کہ اہل ہند کی تمام تر کوششوں اور کاوشوں کے باوجود صورتحال جوں کی توں قائم تھی جو ادبی نقد کا سب سے بڑا محرک ثابت ہوئی۔

اہل ہند اور اہل ایران کے مابین نوک جھونک، طعن و تشنیع، تضحیک و تحقیر اور آپسی امتیازات و تنازعات کا ذکر تو شہنشاہ اکبر کے زمانے سے ہی ملتا ہے لیکن اس عہد کے ادبی معرکوں اور آپسی اختلافات نے کوئی سنجیدہ یا خطرناک شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر سے ان آپسی اختلافات، شخصی تنازعات اور باہمی رنجشوں میں کچھ زیادہ ہی شدت پیدا ہونے لگی تھی، عہد شاہجہانی سے قبل ایرانی دانشور مغل درباروں سے قدرے دور تھے، جس کے سبب آپسی چشمکوں اور ذاتی تنازعات کو بہت زیادہ سر ابھارنے کا موقع نہیں مل سکا اور شاعروں و ادیبوں کے درمیان ہونے والی یہ ذاتی رنجشیں اور رقابتیں خطرناک شکل اختیار نہیں کر سکیں لیکن شاہجہاں کے دورۂ آخر میں ان آپسی اختلافات، ذاتی تنازعات اور ادبی نوک جھونک نے سنجیدہ بلکہ تشویش ناک

شکل اختیار کرلی تھی اور یہاں کے فارسی داں طبقے میں اہل زبان کے احساس برتری اور نسلی تعصب کے خلاف یک گونہ بدسکونی بلکہ بغاوت پیدا ہوگئی تھی، اہل زبان سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے پہلی تحریری اور سنجیدہ ادبی کوشش کا آغاز شاہ جہانی کی ایک مشہور اور معروف علمی شخصیت ملا منیر لاہوری کی طرف سے کیا گیا انھوں نے دیگر لوگوں کی طرح زبانی نشتر چلانے اور ایک دوسرے پر بے بنیاد الزام تراشی کرنے کے بجائے عملی قدم اٹھاتے ہوئے ایک نہائت مختصر رسالہ بنام ''کارنامہ'' تالیف کیا۔ اس عظیم دانشور کی دوررس نگاہوں نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا تھا کہ محض زبانی اعتراضات و ایرادات کے ذریعے اہل زبان سے اپنے جائز حقوق کو ہرگز بھی نہیں منوایا جاسکتا ہے لہٰذا انھوں نے تحریری طور پر اپنا حق حاصل کرنے پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی اور یہ منیر کی اپنی علمی اہمیت کو ثابت کرنے اور اپنا درست ادبی مقام حاصل کرنے کی شدید خواہش ہی تھی جس نے ان کو یہ رسالہ تالیف کرنے پر مجبور کیا انھوں نے اس رسالے میں ایران کے چار بلند پایہ اور قادر الکلام شاعروں (عرفی شیرازی، طالب آملی، ظہوری ترشیزی اور زلالی خوانساری) کے کلام پر سخت ایراد و گرفت کرنے کی کوشش کی ہے ، دوسرے الفاظ میں ان شاعروں کے کلام پر سخت تنقید کی ہے اور ان عظیم المرتبت شاعروں کے اشعار میں موجود فنی، لغوی اور معنوی لغزشوں کو چن چن کر تنقید و تعریض کا نشانہ بنایا ہے عصر حاضر کے تناظر میں منیر کی یہ تعریض و تنقیص معیاری تنقید کے زمرہ میں تو نہیں رکھی جاسکتی کیونکہ ان تحریروں میں فن نقد کے بنیادی اصولوں سے انحراف نظر آتا ہے، با این ہمہ فارسی ادبی نقد میں ان کی اس پہلی تحریری کوشش کو سنگ میل کی حیثیت ضرور حاصل ہے اس رسالے میں منیر نے اپنا پورا زور قلم یہ ثابت کرنے پر صرف کیا ہے کہ زبان و بیان کی لغزشیں اگر ہمارے ملک کے دانشوروں کے یہاں پائی جاتی ہیں تو خود اہل زبان کا کلام بھی تو ان اغلاط اور لغزشوں سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے لیکن جائے افسوس یہ ہے کہ محض اہل زبان ہونے کی بنیاد پر ان کی ان غلطیوں پر کوئی تعریض یا گرفت نہیں کی جاتی اور نہ ہی ان لفظی و معنوی لغزشوں سے ان کی علمی تخلیقات کی اہمیت وارزش میں کسی قسم کا کوئی فرق آنے پاتا ہے جبکہ اس کے بالکل برعکس ایرانی ہونے کے سبب ان کے قلم سے تراوش کی ہوئی ایک غیر اہم یا عام بات کو بھی مستند و معتبر سمجھا جاتا ہے اور اس کو سند کا درجہ حاصل ہوتا ہے جو کسی بھی صورت میں درست اور قابل قبول قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

ہمارے اس دانشور بزرگ کو اس بات کا شدید شکوہ ہے کہ آخر کیوں اہل زبان کی غلطیاں قابل ایراد و گرفت نہیں ہیں جبکہ برصغیر پاک و ہند کے فارسی داں علما کی ایک معمولی سی چوک یا لاشعوری غلطی بھی قابل معافی نہیں ہوسکتی ہے، حتیٰ کہ ان کے قلم سے سرزد ہوئی ایک عام اور چھوٹی سی بات بھی گناہ کبیرہ کے مترادف سمجھی جاتی ہے اور ان کے بے پناہ پرارزش اور پر افادی علمی کارناموں کو درخور اعتناء نہ خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو کہ ایک غیر مناسب اور ناقابل قبول بات ہے لہٰذا منیر لاہوری نے اپنے اس مختصر رسالے میں مذکورہ چار بڑے، ایرانی النسل شاعروں کے کلام میں پائی جانے والی اغلاط کی نشان دہی کر کے اہل وطن کے دلوں میں موجود ڈر و خوف کی کیفیت کو فرو کرنے کا اور فخر یہ طور پر اپنے علمی کارنامے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا'' کارنامہ'' منیر لاہوری کا ایک ایسا عظیم اور آفاقی شاہکار ہے جس کو فارسی ادبی نقد کی وسیع و عریض دنیا میں پہلی تنقیدی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے بہت ممکن ہے کہ منیر سے پہلے بھی اس قسم کے انتقادی رسالے تالیف کیے گئے ہوں، لیکن اس بات کے پختہ ثبوت ہماری دسترس میں نہ ہونے کے سبب کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی البتہ بعض شاعروں اور ادیبوں کے درمیان آپسی نوک جھونک اور نشتر زنی و طعنہ کشی کے کچھ مبہم اور غیر واضح اشارے تو تاریخ اور تذکروں کی کتابوں میں ضرور دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن کسی باقاعدہ کتاب کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملتا ہے یہ ہی سبب ہے کہ دانشوران ادب کی طرف سے'' کارنامہ منیر'' کو ہی فارسی ادبی نقد کی پہلی باقاعدہ تحریری کتاب مانا گیا ہے۔

منیر لاہوری کا'' کارنامہ'' محض تیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے مگر ادبی و تنقیدی نقطہ نظر سے اور اپنے موضوع کی انفرادیت وجدت کے

اعتبار سے اس عہد کی دیگر کتابوں پر سبقت وفوقیت ضرور رکھتا ہے اختصار کے باوجود جامعیت اس کا خاص وصف ہے اس رسالے کی ادبی اہمیت وافادیت کا اندازہ محض اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایران کے جدید ادبی ناقدین نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس میں پیش کردہ اصول قواعد کے مطابق اپنے نئے راستوں کو استوار کرنے کی کوشش کی ہے اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس رسالے کو تحریر کیے جانے کی سب سے بڑی اور اہم وجہ، منؔیر لاہوری کا، اپنے دل کا غبار اور غصہ کو نکالنے کے ساتھ ساتھ اپنی علمی برتری کو ثابت کرنا بھی تھا یہی سبب ہے کہ اس میں تنقید کے بنیادی اصول اور ضوابط کے خیال رکھنے کا کوئی خاص التزام نہیں کیا گیا ہے اور اس کی ایک اور وجہ غالباً یہ بھی رہی ہوگی کہ منؔیر لاہوری کے زمانے میں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس وقت تنقید ایک ادبی فن کی حیثیت سے متعارف نہیں تھی ۔ بہر حال اس رسالے کی انتقادی ارزش وافادیت سے انکار ممکن نہیں ہے ہند و ایران کے محققین و ناقدین ادب نے منؔیر کے ذریعے دکھائی گئی اس مبہم اور غیر واضح روشنی کی مدد سے فن نقد کی انجان، اندھیری اور پر پیچ گلیوں میں اپنے لیے نئی راہیں ہموار کیں اور اس فن کو بام عروج پر پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

منؔیر لاہوری کے بعد جس ہندوستانی عالم نے ان کی آواز پر لب بیک کہا وہ سراج الدین علی خاں آرزؔو ہیں انہوں نے منؔیر لاہوری کے اعتراضات وایرادات کا محاکمہ ومحاسبہ کرتے ہوئے جب اپنا رسالہ ''سراج منیر'' تالیف کیا تو گویا یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اب فن نقد آپسی چشمک وتنازعات یا ذاتی بغض وعناد کی تنگ وتاریک اور محدود ومخصوص گلیوں سے نکل کر ایک باقاعدہ اور سنجیدہ فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہر چند اس رسالے کی تالیف کا مقصد اپنے دل کا بخار نکالنا رہا ہو، لیکن منؔیر کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایرانی شعراء کے کلام پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں وہ محض ذاتی کینہ وبغض پر ہی مشتمل نہیں ہیں بلکہ اس زمانے کی روش کے برخلاف ،صاحب رسالہ نے اپنی تمام تر علمی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہائت ہی عالمانہ انداز میں ان شاعروں کے کلام پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے۔اس رسالے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ فارسی شعر وادب کی اصلاح ہوئی بلکہ وہ لسانیاتی اصول وقواعد جو اس سے قبل تخلیق کاروں کے لیے لائق اعتناء یا قابل توجہ تصور نہیں کیے جاتے تھے، اب عہد منؔیر میں ان باریک نکات کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی اور یہ شاعر بہت محتاط ہوکر اپنا کلام منظر عام پر لانے کی کوشش کرنے لگے، قارئین کے لیے غور وفکر کے نئے دریچے وا ہوئے ، اور ان میں صحیح وغلط کے درمیان فرق کرنے کا واضح شعور پیدا ہوا۔منؔیر کی اس ادبی کوشش کی وجہ سے فارسی ادب میں وہ تازہ جہات اور جالب نکات پیدا ہوئے جن کا تصور کرنا بھی اس دور میں محال تھا انوکھے ونئے اور متحیر ومتعجب کردینے والے حقائق منکشف ہوکر منظر عام پر آئے جن کی مدد سے نیا ذہن بننے اور ادب میں جدت پیدا کرنے میں خصوصی مدد ملی اور بڑی شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ شعر وسخن میں لغت واصطلاح ،عروض وقافیہ اور بیان ومعانی کی بڑی اہمیت ہے جن کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ہویدا ہوئی کہ شاعروں کو کن کن لوازمات شعری اور کون کون سے اہم نکات پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے، منؔیر لاہوری کے اس باقاعدہ عملی اور علمی کوشش نے یہاں کے فارسی داں طبقے میں جو بیداری اور خود اعتمادی پیدا کی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اس مختصر رسالے کی ادبی اہمیت اور انتقادی ارزش کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کے اس عہد کے تقریباً تمام ہی تذکروں میں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے اور منؔیر کی طرف سے کی گئی ان کی اس مخلصانہ اور عالمانہ تحریری کوشش کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ ان کی اعلیٰ ادبی شخصیت اور نقدی بصیرت افروزی کی بھی خوب خوب پذیرائی کی گئی ہے۔اس رسالے کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کی حمائت اور مخالفت دونوں میں ہی مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آراء قلم بند کی ہیں بارہویں صدی ہجری کی نابغہ روزگار ہستی سراج الدین علی خاں آرزؔو نے ان کے اس لازوال ادبی شاہکار اور اس کے جواب میں لکھے گئے اپنے رسالے''سراج منیر'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کارنامہ مشتمل بر اعتراضات چار شاعر کہ یکی از آن زلالی و دوم عرفی و سوم طالب آملی و چہارم ظہوری ترشیزی است و فقیر آرزو جواب اکثر ان رسالہ نوشتہ مسمّٰی بہ سراج منیر بہر حال از مسلم الثبوتان اہل کمال ہند و ایران است''۔[۲]

اس کے علاوہ ''نشترِ عشق'' اور ''روز روشن'' وغیرہ جیسے مشہور تذکروں میں بھی اس رسالے کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے ملا منؔیر لاہوری نے اپنے اس رسالے کا سبب تالیف بے جا ایران نوازی کے خلاف صدائے احتجاج بتایا ہے ان کا کہنا ہے کہ اہل زبان کی بے جا طرفداری اور غیر ضروری حمائت درست نہیں ہے لہٰذا بے جا ایران نوازی کے سحر سے باہر آنا بے حد ضروری ہے منؔیر لاہوری کے اپنے بیان کے مطابق ایک مرتبہ ان کے معاصرین شعراء کسی ادبی محفل میں جلوہ افروز تھے اور آپس میں محو گفتگو تھے ان کی باتوں میں شکوہ روزگار اور شکائت زمانہ کا بازار گرم تھا کہ اب متقدمین کے کمال و کلام کی کوئی اہمیت و وقعت باقی نہیں رہ گئی ہے اور ان کی ذاتی عظمت اور کلام کی ارزش کو پوچھنے والا کوئی باقی نہیں ہے اور وقت موجودہ، ادب نوازی کا نہیں بلکہ ادب بیزاری کا ہے۔ متقدمین نے برسوں کی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے بعد جو ادبی شاہکار تخلیق کیے تھے، معاصرین میں اب کوئی ان کی طرف ایک نگاہ التفات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا ہے، اور ان عظیم شخصیات کے علمی سرمایہ کو بالکل بے وقعت اور بے حیثیت کر دیا گیا ہے۔ جن بزرگوں کے ادبی کارناموں نے کبھی اہل زمانہ کو مسحور و مسرور کیا تھا اب وہ گرد و غبار کے حوالے ہو رہے ہیں جبکہ اس کے بالکل برعکس متاخرین جو کہ اپنے کلام میں کوئی گرمی و نرمی، جوش و خروش، رنگینی و رعنائی اور ندرت و جدت نہیں رکھتے ان کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے اور اپنی تمام تر نااہلی اور ناقابلیت کے باوجود متاخرین شعراء کی شاعری کو اساتذہ کے کلام پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے منؔیر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تو دستور زمانہ رہا ہے کہ باکمال و اہل ہنر حضرات کے کمال و فن کی پذیرائی و تحسین کے بجائے، ان کی بے پناہ عرق ریزی کے بعد تیار شدہ تخلیقات کی عظمت و اہمیت کے اعتراف سے دانستہ طور پر چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے اور ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو پس پشت ڈال کر نااہلوں پر کرم فرمائی کی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا جذبات ہی تھے جو اس رسالے کو تخلیق کیے جانے کا سبب بنے منؔیر لاہوری نے ایرانیوں سے اپنی اہمیت کو منوانے کا عزم مصمم کرتے ہوئے اس رسالے کو تحریر کرنا شروع کا کیا تھا لیکن اس وقت ان کو اپنی اس تحریر کی انتقادی قدر و قیمت کا ہرگز بھی اندازہ نہیں تھا وہ تو صرف اہل ایران سے اپنے ملک کے دانشوروں کی ادبی اہمیت کو منوانے کے متمنی تھے، منؔیر کو بخوبی احساس تھا کہ اہل ایران کے اذہان پر پڑی ہوئی غلط فہمی کی اس دبیز پرت کو ہٹانے کے لیے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلایا جا سکتا، لہٰذا ان کو تحریری طور پر جواب دینا زیادہ بہتر ہے۔ اسی لیے انھوں نے ایران کے مذکورہ بالا جلیل القدر اور رفیع الشان شعراء کے تقریباً (۵۰) اشعار پر شدید اور سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ محض اہل زبان ہونا کسی شاعر کی عظمت اور آفاقیت کی دلیل قرار نہیں دیا جانا چاہیے اور نہ ہی اہل زبان ہونے کی بنیاد پر کسی شاعر یا ادیب کو جامع الکمال ہونے کی سند نہیں دی جا سکتی ہے بلکہ تخلیق کار کی تخلیق پر اپنی رائے کا اظہار کرنے سے قبل ذہن کے آئینہ کو تعصب و طرفداری کی گرد کو پوری طرح سے صاف کرنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جانی چاہیے کیونکہ غلطیاں یا لغزشیں انسانی فطرت کا خاصہ ہیں جو کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہیں محض ایرانی ہونے کی بنیاد پر کسی کے کلام کو فوقیت دینا راست بازی اور دیانت داری کے اصولوں کے خلاف ہے اس رسالے کے دوران تالیف منؔیر لاہوری نے اپنی علمی سوجھ بوجھ اور غور و فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے ان چار شاعروں کے کلام میں موجود لفظی و معنوی تعقیدات کی نہ صرف نشان دہی کی بلکہ ان کو رد کرنے کے سلسلے میں مختلف دلائل اور جواز بھی پیش کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاصرین بھی علم و کمال میں اہل زبان سے کم مرتبہ نہیں ہیں اور نہ ہی متاخرین کو معاصرین پر کسی قسم کا کوئی ترجیح حاصل ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ منؔیر اکثر مواقع پر اپنے اس مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں اور انھیں یہ ثابت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ برصغیر پاک و ہند کے شاعروں کے کلام میں

اگر زبان کی لغزشیں یا فروگذاشتیں ہیں بھی، تو خود اہل زبان کے یہاں بھی تو یہ لغزشیں موجود ہیں لہٰذا یہاں کے شعراء و ادباء کی محنت شاقہ سے تحریر کی گئیں علمی تخلیقات کو بھی وہ ہی مقام و مرتبہ دیا جانا چاہیے جس کا مستحق اہل زبان صرف اپنے آپ کو ہی سمجھتے ہیں لہٰذا تعصب کی عینک اتار کر ایرانیوں کو یہاں کے فنکاروں کے ادبی شہہ پاروں کا مطالعہ و محاسبہ کرنا چاہیے اور طنز و طعن کے نشتر چلانے کے بجائے منصفانہ طریقے سے ان کی تخلیقات پر رائے پیش کرنا چاہئے ملا منیر نے ایک غیر جانبدار اور ہوشمند ناقد کی حیثیت سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس رسالے کی تالیف کا مقصد کسی کی تضحیک و تحقیر کرنا ہرگز بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان کو اہل زبان سے کسی قسم کی کوئی ذاتی رنجش یا عداوت ہے بلکہ ان کا مقصد تو محض اتنا ہے کہ لوگوں کے درمیان پروان چڑھ رہے بے جا ایران نوازی کے اس احساس کو ختم کیا جائے خود ان کے ہم عصر جو اہل زبان کی لیاقت و قابلیت کے کارنامے بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں کہ انھیں اپنے ہم وطنوں کی بے پناہ محنت سے تیار کی گئی تخلیقی، علمی اور ادبی کوششوں میں کوئی جاذبیت نظر نہیں آتی ہے لہٰذا انھیں اپنا یہ غیر منصفانہ رویہ چھوڑ کر ایمانداری کی روش کو اختیار کرنا چاہئے اور اس دیار غیر کے دانشوروں کے جائز مقام و مرتبے کا اعتراف کرنے میں کسی قسم کی کوئی جھجھک نہیں محسوس کرنا چاہئے منیر اپنے غیر متعصب اور غیر جانبدار ہونے کی حمائت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دانائی بخش دانایان آگاہ است کہ تا داد دانشوری دادہ ام بر ہیچ نکتہ نگرفتہ ام، و تا از سخن پیروی طرفی بستہ ام بیغارہ ہیچ زبان دانی نگشادہ ام، و بر ہیچ سخن سنج انگشت نگداشت ام و بد قدر بسر ناخنی بند نکردہ ام...... ایزد سخن آفرین دشمن من باد اگر مرا با ہیچ یکی از آن چار سخن وز خصمی بود...... امید وارم کہ سخن شناسان ہند و معنی رساں ایران بر راست گفتاری من کج مج زبان گرفت نکتہ و پوزش در پزیدند'' ۳

منیر لاہوری کو اپنے معاصرین سے ایک شکایت یہ بھی ہے ان کے عزیزوں اور دوستوں کی بے التفاتی اور بے اعتنائی نے ان کو بہت زیادہ ناامید اور مایوس کیا ہے، معاصرین کی سرد مہری اور لاپرواہی ان کے حساس دل پر نشتر کا کام کرتی ہے ان کی تحریر میں موجود ناراضگی اور خفگی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے معاصرین حقائق کی پردہ کشائی کرنے کے بجائے پردہ داری کرنے کے درپے رہتے ہیں، اہل علم و ہنر کی قدر دانی کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کے مواقع کے تلاشتے ہیں۔ اس دیار میں کوئی شخص کتنا ہی صاحب ہنر، جامع صفات اور صاحب کمال کیوں نہ ہو لیکن اس کی خوبیاں کسی کو نظر نہیں آتیں، ان بے بصیرت حضرات نے از خود کچھ غیر معیاری اور غیر صحت مند قسم کے پیمانے وضع کر لیے ہیں جن میں صداقت اور حقیقت کا کوئی نام و نشان موجود نہیں ہے لیکن افسوس کہ ان ہی غیر معیاری پیمانوں کے ذریعے کسی شاعر کی ادبی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن میں انصاف و عدل کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے معاصرین علم و ہنر کی قدر دانی کے بجائے اہل زبان کی بے جا برتری کے قائل ہیں، ان میں درست اور صحت مند رائے قائم کرنے کا سلیقہ نہیں ہے وہ باطن کے بجائے صرف ظاہر سے متاثر ہوتے ہیں، ان کا، ادبی صداقت و علمی دیانت سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے منیر کو تو یہ بھی شکائت ہے کہ اس عہد میں صرف اور صرف وہ ہی شعراء معتبر، لائق تعظیم اور مدح و ستائش کے حقدار سمجھے جاتے ہیں جن میں مندرجہ ذیل یہ چار خصوصیات پائی جاتی ہوں:

''درین روزگار ارباب سخن بہ چہار صفت موصوف نباشند اگر ہمہ سخن نشان آب حیات است آبی ندارد، نخست پیری چہ جوان طبعی کہ موبہ مواد معنی خیز بود تا محاسن سفید نداشتہ باشد نزد سخن شناسان این عصر روسفید نمی تو اند شد ہر کہ در سال پیری طبع او برنا تر جوان اگر ہمہ معانی جوان انگیز د سر مو بہ اشعار او التفات نمی کنند، و دوم توانگری چہ سخن زر داد، اگر چہ از راستی دور باشد چون نقش نگین بر زر می گیرند، و گفتار مفلس را اگر ہمہ سرائی آن بود کہ بہ آب زر باید نوشت بہ ہیچ نمی خرند، سوم بلند آوازگی چہ نکتہ طرازی کہ نامزد شہرت گشتہ اگر چہ در سخنش صد سخن باشد بہ ہزار شوق می خوانند و سخنوری کہ نام بر نیارد اگر چہ گفتار او نامی بود سہو بر زبان نمی رانند چہارم نسبت ایران چہ اگر ہمہ چون تیغ

ہندی جوہرِ ذاتی آشکار ساز دوم از تحسین نمی زنند''۴

منیؔر لاہوری کا یہ رسالہ جب منظر عام پر آیا تو ہندوستانی فارسی گو دانشوروں کو قدرے راحت اور خود اعتمادی حاصل ہوئی اور اس رسالے کی افادئیت کے سبب اس کو غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اس پر پہلا تحریری ردِعمل سراج الدین علی خاں آرزؔو کی طرف سے آیا جب انھوں نے منیؔر کے ان اعتراضات کا مطالعہ کیا تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس رسالے میں منیؔر کے صرف چند ایرادات ہی ایسے تھے جن میں وہ حق بجانب نظر آتے ہیں جبکہ ان میں سے زیادہ تر اعتراضات بے بنیاد اور ذاتی آراء پر مشتمل تھے اور اکثر مقامات پر آرزؔو کو اساتذہ کے کلام پر ان کی گرفت بے جا اور غیر ضروری محسوس ہوئی لہٰذا اس عظیم دانشور نے صداقت کو منظر عام پر لانے کے لیے'' کارنامہ منیر'' کے جواب میں ایک مختصر سا رسالہ بعنوان'' سراج منیر'' تصنیف کیا اور ان چاروں شاعر جن کے کلام پر منیؔر نے سخت قسم کے اعتراضات وایرادات وارد کیے تھے، ان کا جائزہ لیا اور ان کے کلام کا غیر جانبداری اور دیانت داری کے ساتھ محاکمہ کرتے ہوئے پر جوش انداز میں منیؔر کے بیشتر ایرادات اور اعتراضات کو رد کر دیا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خان آرزؔو کا'' سراج منیر'' عرفؔی، طالبؔ، زلالؔی اور ظہورؔی کے دفاع اور ان شاعروں کی پر زور حمائت میں لکھا گیا ہے اور صاحب'' سراج منیر'' کی پوری توجہ یہ ثابت کرنے پر صرف ہوئی ہے کہ منیؔر کے بیان کردہ تمام اعتراضات نامناسب، بے جا اور غیر اہم ہیں بااین ہمہ بعض مقامات پر منیؔر لاہوری کی گرفت اس قدر سخت، اصولی اور مضبوط ہے کہ خان آرزؔو جیسے بلند پایہ محقق، زبان شناس اور ادبی ناقد کو بھی ان کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے بہر حال ان دونوں رسالوں کے مطالعے سے اس عہد کی ادبی نقد کے درست مزاج ومعیار کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے اور یہ اندازہ لگانے میں بھی آسانی ہوتی ہے کہ اس عہد میں شعراء وادبا کے یہاں غور وفکر کے کون کون سے میزان ومعیار قائم کیے تھے اور ان کے نزدیک شعر گوئی میں کون سے نکات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا تھا۔شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد منیؔر میں ایک عمدہ اور قادر الکلام شاعر کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے ایک شاعر کو بڑے سخت اور دشوار گزار مرحلوں کو عبور کرنا پڑتا تھا بہر حال تفصیلات سے قطع نظر اب ذیل میں منیؔر لاہوری کے چند اعتراضات اور خان آرزؔو کے ان پر دیئے گئے جوابات کو درج کیا جا رہا ہے جن کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھلے ہی اس زمانے میں باقاعدہ یا باضابطہ طور پر تنقید کے اصول وضوابط کو متعین نہیں کیا گیا ہو لیکن شاعروں وادیبوں کے اذہان میں شعر وشاعری سے متعلق کچھ نہ کچھ اصول وقوانین ضرور موجود رہتے تھے جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی وہ اپنی علمی تخلیقات کو اہل نظر کے سامنے پیش کرتے تھے اور غیر شعوری طور پر ہی صحیح ان قواعد وضوابط سے انحراف کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عرفؔی شیرازی ایک بہترین ایرانی شاعر کی حیثیت سے ہر خاص وعام میں مقبول ہیں لیکن ان کے کلام میں موجود بعض فرگذاشتیں منیؔر لاہوری کی دقیق اور دور رس نگاہوں سے بچ نہیں سکی ہیں اب ذیل میں عرفؔی شیرازی کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے جو منیؔر لاہوری کی سخت تنقید وتعریض کا نشانہ بنا ہے عرفؔی کہتے ہیں:

''شاہد عصمت تلاش صحبت من کی کند　　　　خون حیض دختر رز جوشد از لب ہای من''۵

منیؔر لاہوری کو عرفؔی شیرازی کے مذکورہ بالا شعر پر سخت اعتراض ہے ان کا کہنا ہے کہ اہل زبان شاعر یعنی عرفی شیرازی نے اس شعر کو کثافت وگندگی کی مثال بنا کر اہل جہاں کے سامنے پیش کیا ہے کیونکہ اس میں حسن، معنی آفرینی، جدت اور تازہ گوئی جو کہ عرفی کی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، اس میں اس کا دور دور تک بھی کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا ہے جبکہ اس کے بالکل برعکس اس شعر کو پڑھ کر تو طبیعت میں شگفتگی وشادابی پیدا ہونے کے بجائے ایک بوجھل پن، اکتاہٹ اور کثافت پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا عرفؔی کے لیے لازم ہے کہ وہ شرمندگی کے آب سے اس آلودگی کو دور کرنے کی کوشش کریں، منیؔر اپنے اعتراض کو مندرجہ ذیل الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

’’این بیت رنگین بہ کھنتہ الشعر حیض الرجال را آب دادہ بہ فتوای انصاف زبانی کہ بہ این بیت آلودہ گردد بروی واجب است کہ ازعرق انفعال تازید غسل کند، پیداست کہ از این دست سخن ناپاکیزہ ورنگن نگاشتن خون انصاف ریختن است‘‘۔[۶]

خان آرزؔو جو کہ عرفؔی شیرازی کو فارسی زبان وادب کا ایک عظیم شاعر تسلیم کرتے ہیں ان کے نزدیک عرفؔی صرف ایک شاعر کا نام نہیں بلکہ ایک جامع کمالات شخصیت کا نام ہے جو اپنے معاصرین میں زبردست شاعرانہ آن وبان وشان رکھتے ہیں ان کے کلام پر انگلی اٹھانا گویا ایک بڑے فن کار پر الزام لگانے کے مترادف ہے ان کے یہاں مضمون آفرینی اور تازہ گوئی کی ایسی مثالیں موجود ہیں جو متقدمین ومتاخرین شعراء کے کلام میں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہیں لہٰذا وہ عرفؔی کے اس شعر کے حمائت میں نہ صرف یہ کہ تفصیلی بحث کرتے ہیں بلکہ اپنے دعویٰ میں پختگی اور وزن پیدا کرنے کے لیے اساتذہ ٔفن کے کلام سے کئی مثالیں بھی بطور سند پیش کرتے ہیں اور نہائت عالمانہ انداز میں منیؔر کا رد بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو جواب دیتے ہوئے بڑے سنجیدہ اور متین لہجے میں اپنی رائے قلم بند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ منیؔر نے شعر کا جو مطلب اخذ کیا ہے حقیقتاً وہ اس کا درست مفہوم نہیں ہے، اور اگر ایسا ہوتا تو پھر اساتذہ کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں وہ منیؔر کے اعتراض کا مندرجہ ذیل الفاظ میں رد پیش کرتے ہیں:

’’این قسم نوعی خفت از شاعر است نہ غلط شعراء ودر کلام استادان بسیار واقع است انورؔی نسبت بہ خود گوید:

خسروا بندہ را چودہ سال است     کہ ہمی آرزو آن باشد
کز ندیمان مجلس ار نشود     از مقیمان آستان باشد
بہ خرش پیش از آن کہ بفروشی     و آنگہت رایگاں گراں باشد
تاچہ باشد کہ روز کی چندی     گردی از گہر دران باشد

وازاین عالم است آن چہ استاد خاقانؔی گفتہ:

از ان شد پردہ چشم بہ خون بکری آلودہ     کہ غم بالعبتان دیدہ جفتی کرد پنہانی

بلکہ زیادہ از این نیز گفتہ، چنان کہ ہجو زن خود از انوری بدان کہ بعضی از شارحان قصاید عرفی بر این بیت اعتراض گفتہ اند کہ اضافت خون حیض سوی دختر رز وقتی درست می شود کہ رز انگور را گویند واین نیز از غلط فہمی است، چرا کہ اضافت تشبیہ واستعارہ وکنایہ ہر دو درین جا درست می شود وایہام کافی است، بلکہ دختر رز بہ معنی انگور نیز آمدی‘‘۔[۷]

عرفؔی شیرازی فارسی زبان کے ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے کلام پر کسی کی بھی طرف سے کی گئی کوئی بھی تنقیص یا گرفت ان کی شاعرانہ عظمت اور شہرت کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی البتہ ناقد کی اپنی ہی شخصیت کو مشکوک ضرور بنا سکتی تھی لیکن منیؔر نے ان کی علمی لیاقت اور شعری صلاحیتوں سے مرعوب ہونے کے بجائے بہ بانگ دہل اس بات کا اعلان کر دیا کہ بڑے سے بڑے ایرانی کے کلام میں بھی اغلاط راہ پا سکتی ہیں لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے اشعار پر بھی گرفت کی جائے تاکہ شعروسخن کا درست معیار قائم کیا جا سکے اب عرفؔی کا ایک اور خوبصورت شعر دیکھیں جو منیؔر کی بے جا بلکہ رحم تنقید اور غیر ضروری تعریض کا شکار ہوا ہے عرفؔی شیرازی کچھ اس طرح نغمہ سرا ہوتے ہیں:

’’نثار مقدم اندازہ توچشم ملوک را     غبار دامن آوازۂ تو گوش بلاد‘‘۔[۸]

منیؔر لاہوری کو مندرجہ بالا شعر پر یہ اعتراض ہے کہ گوش بلاد یعنی کسی ’’شہر یا علاقے کے کان‘‘ شاعر کی طرف سے یہ ایک نہائت ہی عجیب وغریب

ترکیب وضع کی گئی ہے جبکہ اس طرح کی کوئی بھی ترکیب اساتذہ کے کلام میں تو کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی ہے اور نہ ہی ''غبار دامن آوازہ'' جیسی کسی تشبیہ کا پتہ چلتا ہے اور عرفؔی شیرازی کے کلام علاوہ کہیں اور کسی شاعر نے اس کو استعمال نہیں کیا ہے منؔیر صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ عرفؔی کے اس شعر کی اصلاح بھی کرتے ہیں اور خالق شعر کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر شاعر کی طرف سے اگر گوش بلاد کے بجائے ''گوشہائے بلاد'' استعمال کیا گیا ہوتا تو بلاشبہ اس شعر میں ایہام کا حسن کئی گنا بڑھ گیا ہوتا اور شاعر کی توقیر و توصیف میں بھی اضافہ ہو جاتا، لیکن افسوس کہ ہمارے اس شاعر عالی نے اس طرف توجہ دینے کی بالکل بھی زحمت ہی گوارہ نہیں کی ہے اور یہ ہی سبب ہے کہ یہ شعر تنقید کا نشانہ بنا ہے منیر لاہوری مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا اعتراض درج کرتے ہیں:

''گوش بلاد ہیچ سخن نہ شنیدہ و غبار دامن آوازہ ہیچ دقیقہ بینی ندیدہ و با این ہمہ گوش را بہ غبار تشبیہ کردہ و گرداز نہاد سخن برآوردہ، بلاد را گوش انگاشتہ و معنی را گوش نداشتہ اگر گوش ہای بلاد گفتی سخن بہ مددگاری ایہام حسن دوبالا پیدا کردی و معنی بہ ہیچ حرفی گوشمال نخوردی''۹

سراج الدین علی خان آرزؔو نے منؔیر کی مذکورہ بالا تنقید کو بھی غیر اہم، لایعنی اور بے بنیاد قرار دیا ہے اور اس کا بہترین جواز بھی پیش کیا ہے آرزؔو کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا شعر میں بلاد سے شاعر کی مراد کوئی شہر یا علاقہ قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کے ذریعے تو شہر کے رہنے والے لوگوں کو مراد لیا گیا ہے مثلاً فلاں چیز کے تماشے کے لیے تمام شہر باہر نکل آیا یہاں شہر سے مراد شہر کے لوگ باہر نکل آئے یا پھر اس طوفان نے پورے شہر کو سونے نہیں دیا یعنی شہر میں رہنے والوں کو سونے نہیں دیا، لہٰذا عرفؔی شیرازی کے اس خوبصورت اور دل کش شعر پر گرفت یا ایراد کرنا پوری طرح نامناسب بلکہ ان کی کم فہمی ہے اور پھر ایک مثال دے کر اپنی بات کو زیادہ مستند و محکم بنانے کی بھی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ چشم معشوقان سے مراد کسی انسان یا معشوق کی صرف ایک چشم نہیں ہوتی ہے بلکہ ''چشمہا'' یعنی دونوں آنکھیں ہی مراد ہوتی ہے پھر آگے کہتے ہیں کہ ہر چند کہ غبار، گوش سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں رکھتا ہے لیکن بہ سبب اضافت بلاد کی طرف مناسبت ہو سکتی ہے جو بالکل صحیح ہے انھوں نے اپنی بات کو مزید باوزن اور مستند کرنے کی غرض سے ایران کے سب سے بڑے شاعر سعدؔی شیرازی کا ایک بہترین شعر بھی یہاں نقل کیا ہے:

گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاک گور''۱۰

خان آرزؔو نے اپنے اس رسالے یعنی ''سراج منیر'' میں ''منؔیر لاہوری'' کے ان اعتراضات و ایرادات کو بھی رد کیا ہے جو انھوں نے ایک اور بڑے ایرانی نژاد شاعر طالبؔ آملی کے کلام پر وارد کیے ہیں حالانکہ طالبؔ آملی فارسی زبان و ادب کا ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے متعارف تھے اور ان کی شعری خصوصیات درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں لیکن آرزؔو کے مطابق، منؔیر نے ان کی شاعرانہ عظمت و کمال پر خط تنسیخ پھیرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے اور ان کے کلام پر بہت زیادہ درشت و شدید لہجہ میں گرفت کی تھی اب ذیل میں ہم طالب آملی کے کلام پر منؔیر لاہوری کے فقط ایک یا دو اعتراض اور اس سلسلے میں خان آرزؔو کے جوابات کا مطالعہ کریں گے جن سے ان دونوں علمائے ادب کی نقدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے طالبؔ آملی کا ایک بہت ہی مشہور و معروف شعر ہے:

''خونؔ اثر کہ زینت منقار بلبل است از ناخن ترنم زاغم فشردہ اند''۱۱

منیرؔی لاہوری، طالبؔ آملی کے اس شعر کا نہائت ہی باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں اور اس کو قابل ایراد قرار دیتے ہوئے بہت ہی دلچسپ اور طنزیہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے مندرجہ الفاظ قلم بند کرتے ہیں:

''اگر در ناخن ترنم ناخن بند کنم مشتی احمقان کہ این سخن بر دل می زنند یا من چون ناخن کاوش می کنند و گفتار مرا بہ یک سر ناخن در نمی پذیرند''۱۲

خان آرزو کی نظر سے جب منیرؔ کی یہ تنقید گزرتی ہے تو وہ عادتاً بلکہ فطرتاً اس گرفت کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اس کا محاکمہ کرتے ہوئے اس کا ردپیش کرنے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری شعوری کوشش اور علمی تبحر کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں منیرؔ لاہوری کی کہی ہوئی باتوں کی ہمنوائی کرتے نظر آتے ہیں وہ منیرؔ لاہوری کو بڑے مفصل و مدلل انداز میں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناخن دخل بی جایی است کہ روی سخن را خراشدوز مین شعراء کاود، چون ناخن تراشیدہ در خاک بہتر است''

برمن زبان طعن سخن چین بہ طبع کج ہر گہ شود دراز چو ناخن بریدنی ست

الحاصل، ناخن ترنم بہ موجب کلیہ کہ سابق مرقوم گشت استعارہ بالکنایہ است، دوری تشبیہ بہ طرز متاخرین ونزدیکی نسبت بہ سبب آن کہ ترنم از ساز نواختن ناخن گاہی باشد، لیکن فقیر آرزو را در نسبت زاغم، تر ددی ہست، زیرا چہ در صورت اضافت تشبیہی قباحت است و استعارہ'' ۱۳

مندرجہ بالا سطور سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سراج الدین علیخان آرزو منیرؔ کو رد کرنے اور عام قارئین کے مطمئن کرنے کے سلسلے میں بڑی حدتک کامیاب رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ منیرؔ لاہوری کی بے انتہا ذہانت اور فکر رسا کی بھی تعریف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں جو اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ منیرؔ لاہوری کا مرتبہ ادبی اعتبار سے خاصا بلند اور اعلیٰ رہا ہوگا اور اب ذیل میں طالبؔ آملی کا ایک اور شعر درج کیا جارہا ہے جس کو منیرؔ لاہوری کی طرف سے قابل گرفت قرار دیا گیا ہے:

''زبس ترشح می شود در دماغ انگیخت جبین گشای لب خندۂ نمک داں شد'' ۱۴

فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے حضرات مندرجہ بالا شعر کی موزونیت اور غنائیت سے بخوبی واقف ہیں لیکن منیرؔ نے بغیر کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے اس شعر بھی پر نہائت دلچسپ اور خوبصورت انداز میں تنقید کی ہے گرفت کا انداز نہایت سنجیدہ، متوازن اور معتدل ہے وہ مختصر انداز میں اس شعر پر گرفت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''خندہ نمک دان ولب خندہ وجبین گشای لب از ہم نمکین ترند، این طرز نمک بہ جز او دیگری را دست نداد ہ'' ۱۵

سراج الدین علی خاں آرزو یہاں بھی منیرؔ کے ہم خیال نہیں ہو پاتے ہیں اور قدرے تفصیلی انداز میں ان کا رد پیش کرتے ہیں اور منیرؔ کو ان کی علمی اہمیت وعظمت کا احساس کراتے ہوئے ان پر بھرپور طنز بھی کرتے ہیں کہ ایک صاحب علم سے اس طرح کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اساتذہ کے کلام پر غیر ضروری تعریض اور تنقیص کرے اور اس طرح کا کرخت اور نامناسب انداز بیان اختیار کرتے ہوئے وہ ان کے کلام پر اعتراض وگرفت کرے چنانچہ وہ بظاہر سنجیدہ اور باوقار لیکن حقیقتاً چبھتا ہوا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''چاشنی خوار مایدۂ سخن می داند کہ این معنی من وسلوا است کہ از آسمان فکر عالی نازل گشتہ لیکن ذایقہ می باید حاصل کہ لب خندہ در این شعر نیست بلکہ خندہ مضاف الیہ جبین گشای است معہذ الب خندہ عبارتی است آمدہ در محاورہ وانکار آن از کمال عدم تتبع، وجبیں گشای لب استعارہ خوب وتشبیہ بلیغ است، چہ جبین گشای را کہ عبارت است از برطرف کردن چین جبین تشبیہ نازک است یا واشدن لب وہم چنین گشادن لب را با واشدن نمک دان، واین واں شدن را بہ خندہ تعبیر کردہ، چہ خوب کردہ'' ۱۶

منیرؔ لاہوری نے ایران کے ایک اور بزرگ اور قد آور شاعر زلالی خوانساری کے کلام پر بھی تیز وتند لہجے میں سخت قسم کے ایراد واعترض وارد کیے ہیں

یہاں بھی منیؔر کا صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر اہل زبان شعر کہتے وقت غلطیوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں تو پھر عتاب صرف بیچارے ہم وطنوں پر ہی کیوں نازل ہوتا ہے اور زبان کی ایک معمولی سی لغزش پر ان کے علمی مرتبہ کو سمجھنے اور اس کو قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے، بہر حال منیؔر کی اس مخلصانہ اور ہمدردانہ کوشش کو پوری طرح نظر انداز بھی نہیں کیا جانا چاہیے، اب زلالیؔ خوانساری کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے جو منیؔر کی گرفت میں آنے سے بچ نہیں سکا ہے یہ بزرگ شاعر کچھ اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے:

''قلم از من بہ غواصی درآمد سر زلفش بہ رقاصی در آمد'' ۱۷

زلالیؔ کے مذکورہ بالا شعر پر بھی منیؔر لاہوری کو سخت اعتراض ہے منیؔر کے مطابق ''رقص'' کو ''زلف'' سے کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی ہے جبکہ زلالیؔ خوانساری نے اس کو اپنے شعر میں بیان کر کے گویا اپنی کم فہمی پر مہر ثبت کردی ہے اس کے علاوہ انھوں نے قلم نازک زبان کی ترکیب کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے وہ اپنے اعترض کو مندرجہ ذیل الفاظ میں رقم کرتے ہوئے بڑا ہی خفگی بھرا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''رقاصی سر زلف ادائی است کہ برآں رقص تواں کرد موشگافان معنی می دانند کہ قلم بلند بالا کہ از سیاہاں ہندواست خط دارد، اما زلف ندارد، واگر زلف داشتہ باشد رقاصی را بہ سر زلف چہ نسبت، ہمانا قلم نازک زبان اور بہ سر زلف حرف زدہ است کہ ہیچ پا بر جا ندارد'' ۱۸

خان آرزوؔ نے منیؔر کے بیان کردہ اعتراض کو رد کرتے ہوئے زلالیؔ کی پرزور حمائت کی ہے اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کر دیا ہے یہاں خان آرزوؔ نے بالکل مناسب و موزوں طریقے سے منیؔر کے اعتراض کا رد پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے میں پوری کامیابی حاصل کی ہے کہ منیؔر اس بلند پایہ شاعر کے اس خوبصورت شعر کے اصل معنی و مفہوم تک رسائی حاصل نہیں کر سکے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے اس شعر کو ہدف ملامت بنایا ہے لیکن وہ یہاں بھی منیؔر لاہوری کی فکر رسا اور دقیق بینی کی تعریف و تمجید کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے سا ایراد اور گرفت کو بڑی حد تک قبول بھی کرتے ہیں آرزوؔ، منیؔر لاہوری کے مذکورہ بالا اعتراض کا رد پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' سر زلف قلم استعارہ بالکنایہ است و سر زلف عبارت است از خط و این تشبیہہ نازکی دارد و رقاصی سر زلف کنایہ است از آرائش یافتن، لیکن ربط بین المصرین چون ابروی گشادخوبان و مانند میان محبوبان ہیچ نیست پس اگر این معنی را دست مایہ انگشت اعتراض گذاشتن می ساخت برجا بود'' ۱۹

مندرجہ بالا محاکے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان آرزوؔ غیر معمولی فہم و فراست کے مالک ایک بہترین عالم تھے اور ان کی، شعری آئین و ضوابط پر بڑی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ منیؔر لاہوری جیسے فارسی زبان و ادب کے ایک جید عالم کو رد کرنے کی غرض سے مضبوط دلائل پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں لیکن یہاں ان دونوں دانشوروں کے یہاں بڑا تفاوت یہ ہے کہ آرزوؔ جواب دیتے وقت یا منیؔر کے اعتراض کو رد کرتے وقت کہیں بھی منیؔر کی طرح سخت اور متشدد نہیں ہوتے ہیں بلکہ متین اور محتاط انداز میں اپنی بات رکھتے ہیں جو ان کے ایک ہوشمند انسان ہونے کی دلالت کرتا۔ اب زلالیؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جس کو منیؔر کی طرف سے ناموزوں قرار دیا گیا ہے:

''جبین از بہر دزد آشنا رنگ کمان و ترکش چین بر سر جنگ'' ۲۰

منیؔر لاہوری نے اس شعر پر تنقید کرتے وقت اپنی طبیعت کے برخلاف قدرے شگفتہ اور شوخیانہ انداز اختیار کیا ہے لیکن اس شگفتگی اور شوخی کے پیچھے کی چھپی ہوئی نشتریت کو صرف وہ ہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو منیؔر لاہوری کے ساتھ ان کے اس ذہنی سفر میں ان کے ساتھ ہم سفر بن گیا ہو، منیؔر اپنا اعتراض مندرجہ

ذیل الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

''این بیت کہ چین سہو درابرویش پیداست، آرایش پیشانی گفتاراوست، اما ازین کمانی بہ معنی تواں بردو نہ ازین ترکش نشاں مطلب تواں یافت''۔۲۱

زلالی کے اس شعر پر منیر کی گرفت بہت سخت اور برمحل ہے اوران کی سنجیدہ غور وفکر اور بہترین تنقیدی بصیرت کی شاہد ہے اس شعر پر منیر کا اعتراض اس قدر اصولی و مدلل ہے کہ آرزو کو بھی چار و ناچار ان کا ہم خیال ہونا پڑا ہے اور ان جیسا متبحر عالم بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس اعتراض میں منیر لاہوری حق پر ہیں اور زلالی کا مذکورہ شعر واقعی قابل گرفت ہے بااین ہمہ وہ شعر کا رد بھی پیش کرتے ہیں لیکن ایک سچے اور دیانت دار ناقد کی طرح منیر کی بہترین کارکردگی کی تعریف وتوصیف بھی کرتے ہیں اور ایک ایماندار ادبی ناقد کی یہ ہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت کو اپنے پیش نظر رکھے اور ذاتیات سے بے نیاز ہو کر اپنے خیالات کا ظہار کرے اور حقیقت بینی اور حق گوئی خان آرزو کا وصف خاص ہے جو ادبی ناقدین کے جم غفیر میں ان کو نمایاں اور بلند مقام عطا کرتا ہے یہ ان کی بے پانہ علمی دیانت اور ادبی صداقت ہی ہے جس کے پیش نظر مندرجہ ذیل جملے ان کے قلم سے بے ساختہ طور پر تراوش کر جاتے ہیں:

''مراد از کمان ابرو و از ترکش چین ابرو و زد آشا رنگ دز دخانگی ارادہ نمودہ، و براین تقدیر معنی از آن حاصل می شود لیکن انصاف آنست کہ جامعۂ معنی برقامت لفظ بسیار کوتاہ است و بعد آوردن حاصل ہیچ چنانکہ برسخن فہم پوشیدہ نیست وحق دراین جا بہ طرف ابوالبرکات منیر است''۔۲۲

سراج الدین علی خان آرزو نے اپنے اس رسالے یعنی ''سراج منیر'' میں منیر لاہوری کے ان اعتراضات کے جوابات کو بھی پیش کیا ہے جو انھوں نے مشہور و معروف ایرانی شاعر ظہوری ترشیزی پر کیے تھے خان آرزو ظہوری ترشیزی کے شاعرانہ عظمت و کمال کے بھی تہہ دل سے قائل ہیں اور ان کو ایک بلند مرتبہ، روشن فکر اور قادر الکلام فارسی شاعر تصور کرتے ہیں ذیل میں ظہوری کے صرف چند اشعار پر منیر لاہوری کے ایراد و گرفت اور خان آرزو کے جوابات کو تحریر کیا جا رہا ہے جس سے اس دور کے تنقیدی نکات و جہات کو سمجھنے میں خصوصی مدد ملتی ہے مثلاً ظہوری اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح نغمہ سرا ہوتے ہیں:

''بہ رشح سبوی می آبرو منقش کدوی سر آرزو''۔۲۳

منیر لاہوری نے ظہوری ترشیزی کے تمام تر علمی مقام و مرتبہ کی فضیلت سے قطع نظر نہائت بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ ان کے کلام پر ایراد و گرفت کرتے ہیں اور مختصر طور پر نقد و انتقاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آرزو را سر پدید آوردن و آن سر بہ کدو سنجیدن و بر آں کدو نقشی نگاشتن وجہ آن نقش سوگند خوردن شیوہ ای است نو آئین مخصوص سحر پیشۂ آن تازہ گفتار''۔۲۴

جب خان آرزو منیر لاہوری کے اس اعتراض کا مشاہدہ و محاسبہ کرتے ہیں تو منیر کی ناانصافی اور متعصب رویہ دیکھ کر بے ساختہ ایک تلخی اور سختی ان کے لہجے میں عود کر آتی ہے اور شعوری کوشش کے باوجود وہ اپنی لہجے کی اس ترشی و تلخی کو چھپا نہیں پاتے ہیں اور بے اختیار ان کے قلم سے یہ سخت کلمات نکل جاتے ہیں جو منیر کے اعتراض کا بھرپور رد کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے دلوں پر خان آرزو کی علمی عظمت کے گہرے نقش مرتب کرتے ہیں:

''از طرز استعارہ کہ نمک خوان شعر است ذائقہ معترض محروم است والہذا این قسم بی نمک گوئی را ماحضر سفرۂ جلد کلیات خود ساختہ و بہ شستن دست از آبروی شعر پرداختہ، مخفی نماند کہ در معنی مصرع اول راقم حروف را ترددی واقع گشتہ، بدان سبب کہ رشح سبوی می آبرو بہ معنی ریختن

آبرو گوکم باشد مناسب قسم خوردن نیست''۲۵

اب ظہوریؔ ترشیزی کا ایک اور دل کش وخوبصورت شعر دیکھیے جو منؔیر لاہوری کی زبردست ملامت کا نشانہ بنا ہے:

''بہ برج قدح بر تراش از حباب برای شب عشرتم آفتاب''۲۶

منؔیر لاہوری کو مندرجہ بالا شعر میں بروئے کار لائی گئی ''تراشیدن آفتاب'' کی ترکیب پر سخت اعتراض ہے کیونکہ یہ ایک نئی اور غیر مانوس ترکیب ہے جو دیگر شاعروں کے کلام میں موجود نہیں ہے لہٰذا وہ اس پر گرفت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تراشیدن آفتاب، تراشیدۂ جدت طبع اوست، وگرنہ روشن است کہ سزا یش تراشیدن چوب وسنگ دارد، نہ ماہ و آفتاب''۲۷

خان آرزو، منؔیر کی اس گرفت کو ان کے ذاتی بغض وعناد اور تعصب وطرفداری پر محمول کرتے ہیں اور منؔیر پر سخت الفاظ میں طعن وطنز بھی کرتے ہیں ان کے مطابق اس شعر پر منؔیر کی گرفت صرف ان کے ذاتی بغض، دلی رنجش اور باہمی عداوت کی مثال کہی جا سکتی ہے ورنہ شعر کے بلند وارفع ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے وہ نہایت سخت الفاظ میں اس کا رد پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''چشم بد تعصب کور باد در این جا استعارہ از آفتاب روشن تر است، درصورتی کہ چوب را باید تراشید، آفتاب تراشیدہ جدت طبع اوست چگونہ درست نباشد، اگر گویند این مجاز است، گویم اگر حقیقت شناسی آن جا نیز ھمین خیال کن''۲۸

ظہوریؔ کا اور دلکش شعر جو منیر کی نقد کا شکار ہوا ہے:

''دہد ابر تا کشت غم را بہ آب ز باران رواں کرد سیل شراب''۲۹

اب منؔیر کا مودبانہ ومہذبانہ انداز میں کیا گیا طنز ملاحظہ کیجئے انھوں نے مذکورہ بالا پر شعر طنز کے نشتر چلانے کے ساتھ ساتھ شعر پر اپنی بہترین اصلاح بھی پیش کی ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ ان کی جانب سے کی گئی اس اصلاح نے شعر کے حسن کو بڑھا دیا ہے اور اس کی معانی آفرینی کی لذت کو بھی کئی گنا کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی نقد واصلاح اس ناقد ادب کی ناقدانہ بصیرت کی آئینہ دار بھی ہے، وہ کہتے ہیں:

''باران را شراب گفتن از مستی است، نہ از ہوشیاری اگر بہ جای سیل شراب عالم گفتی سخن خود را تو انستی آب داد''۳۰

لیکن خان آرزؔو مذکورہ بالا شعر پر منیر لاہوریؔ کے اس اعتراض کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس ایراد کو ان کی ناواقفیت اور ذاتی بغض پر محمول کرتے ہیں اور مودبانہ لہجے میں کہتے ہیں:

''آرزو گوید بہ کیفیت باران نرسیدہ ولہٰذا لطف این بیت نفہمیدہ بیگانۂ طرز ظہوری است ازین سبب عالم آب را در این جا مناسب دانستہ بحق بہ طور معترض مناسب است نہ بہ طرز ظہوریؔ وہر کہ بہ شعراء مناسبت دارد این معنی را می یابد''۳۱

بہر حال نقد منؔیر اور محاکمہ آرزؔو کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں ہی دانشوروں کے یہاں تنقیدی بصیرت اپنے اعلیٰ پیمانے پر موجود تھی یہ دونوں ناقدین ادب تیز ادراک، زندہ احساس، بیدار دل، وسیع النظر اور عمیق دماغ کے مالک تھے انھیں ذی فہم اور حساس دانشوروں کی پیش قدمی اور عملی اقدام کے سبب فارسی ادب میں گرانقدر تنقیدی سرمایہ وجود میں آیا، جس کی مدد سے نہ صرف اس عہد بلکہ بعد کے ادبی ناقدین کے تنقیدی شعور کو بھی خوب جلا ملی، شاعروں اور ادیبوں کے لیے ادبی کی تخلیقات وجود میں لانے کے متعلق بہت سے نئے معیار اور میزان سامنے آئے اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر بھی کیا گیا شعر وادب کے حسن وقبح کی جانچ اور پرکھ کے لیے بھی بہت سے نئے پیمانے وضع کیے گئے یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آپسی چشمک ایک

دوسرے کی دل شکنی ودل آزاری، شخصی پسند وناپسند اور ذاتی بغض وعناد کے باوجود بھی مخالف وموافق فریقین کے سامنے ادب کے باریک نکات ہی رہتے تھے اور وہ لوگ دوران نقد وتبصرہ انھیں ادبی نکات کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تھے ان بحث ومباحث اعتراض وایراد اور مناقشوں ومعرکوں میں جو دل چسپ نکات پیش نظر رکھے گئے تھے وہ عمل، ورد عمل کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے رہے جن کا ادبی حلقوں اور بیدار ذہنوں پر گہرے اور دیرپا نقوش مرتب کیے اور ہر عام وخاص کا ذہن نئے انداز سے غور وفکر کی جانب مائل ہوا اور اس طرح فارسی ادبی نقد اپنے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا رہا تنقید کے ان شروعاتی نمونوں پر ایک بلند وبالا عمارت قائم ہوتی چلی گئی۔

منیر کے رسالے ''کارنامہ'' کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صاحب کتاب اعلیٰ تنقیدی بصیرت کا مالک ہے اور جب وہ اہل زبان کے کلام پر ایراد واعتراض کرتے ہیں تو ان کی ساری علمی لیاقتیں اور ذہنی صلاحتیں بیدار ہو کر اس کے سامنے دست بستہ کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ جس طرح اور جس انداز میں چاہتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں، حالانکہ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں کہ ان کی جانب سے کیے گئے بیشتر تنقیدی نکات میں شدت پسندی، تلخی روئی اور شدید لب ولہجہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی اعلیٰ تنقیدی بالغ نظری کا ثبوت بھی ملتا ہے بعض مواقع پر ان بزرگ شعراء کے کلام پر دی گئی رائے فارسی زبان سے متعلق بہت سے اصول وقواعد کی اغلاط کی نشاندہی، بہت ہی ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے لیکن اکثر مواقع پر وہ غیر جانبداری کے اصول کو ملحوظ خاطر نہیں رکھ سکے ہیں اور اعتدال کا دامن اس کے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بذات خود بھی خطرناک تنقید کے دائرہ میں پھنس کر رہ گئے یعنی اکثر مواقع پر تنقید کرتے وقت توازن برقرار نہ رکھ پانے کے سبب خان آرزو کی زبردست ناقدانہ صلاحیتوں کے پیش نظر ان کی شہرت کو چوٹ بھی پہنچی ہے اور بعض مقامات پر وہ بے احترامی، خودشناسی اور خودسری جیسے القاب کے مرتکب ہو گئے ہیں لیکن اس باوجود ان کی بے پناہ ناقدانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر تو ان کے اعتراضات اتنے اصولی، سخت اور شدید ہو جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑے ادبی ناقد کے پاس ان کو رد کرنے یا ان پر انگلی اٹھانے کا جواز نظر نہیں آتا ہے۔

منیرؔ لاہوری کے تنقیدی رجحانات کی اور خان آرزوؔ کے جوابات کی روشنی میں ایک اہم بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ منیرؔ اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ رائج شدہ محاورات، تراکیب، استعارات، تشبیہات اور بندشیں جو زمانۂ گذشتہ سے کلاسیکی فارسی شعر وادب میں مستعمل ورائج ہیں انھیں کو بروئے کار لایا جائے ان کا ماننا ہے کہ شاعر کا کلام اس وقت قابل گرفت ہو جاتا ہے جب کوئی شاعر عام روش سے ہٹ کر شعر کہتا ہے نئی چیزوں کی جستجو اور قدیم روایات سے انحراف اس کے علمی وقار کو کم کر دیتا ہے مزید برآں خلاف رائج محاورات واصطلاحات، نئی تراکیب وبندشوں کا استعمال کلام میں کوئی جاذبیت وندرت پیدا نہیں کرتا بلکہ کلام کو بوجھل، گراں بار اور قابل ایراد بنا دیتا ہے لیکن صاحب ''سراج منیر'' کو صاحب ''کارنامہ'' کی اس بات سے شدید اختلاف ہے ان کے مطابق اگر کوئی شاعر عام روش سے ہٹ کر اپنا کلام پیش کرتا ہے تو اس پر بے جا ایراد واعتراض کرنا درست نہیں ہے کیونکہ لکیر کا فقیر رہنا، پرانے راہوں پر چلتے رہنا، کہنہ وفرسودہ مضامین وخیالات کو مسلسل نظم کرتے رہنا زبان وادب کی ترویج وترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے جدت بیان، نادر تراکیب، نئے استعارات، جدید تشبیہات اور جالب نکات سے ہی زبان وادب کی ترقی کے راستے ہموار ہوتے ہیں اور انھیں کی مدد سے ادب کو از سر نو زندگی حاصل ہوتی ہے مگر منیرؔ کے یہاں اس صداقت سے انحراف وبیزاری کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ تقلیدی روش کے قائل ہیں ان کے بیشتر اعتراضات ان کے انھیں رجحانات ونظریات کی تائید کرتے نظر آتے ہیں جن میں ان کو اساتذہ شعراء سے یہ ہی شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں عجیب وغریب تشبیہات واستعارات کو استعمال کر کے اشعار کے لفظی ومعنوی حسن کو زائل کر دیا ہے، تنقید کرتے وقت ان کی تمام تر توجہ اسی بات پر مبذول رہتی ہے کہ شاعر نے دوراز کار تراکیب، پیچیدہ مضامین کو قلم بند کر کے

اور اپنے لیے نئے راستے تلاش کرنے کی کوشش میں اپنے کلام کو اغلاط ولغزشوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے انھوں نے اساتذہ کے کلام پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں ان میں انھوں نے لغت فہمی واصول وقواعد کے ضابطوں اور اصولوں میں ہی دیکھنے کی کوشش کی ہے ان کے نزدیک اعلیٰ اور معیاری شاعری وہی ہے جو فارسی زبان کے اصول وتراکیب کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہو بے شک دوران تنقید انھوں نے بعض مقامات پر نہائت عمدہ اور سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان وادب کے بڑے رمزشناس تھے لیکن فن شناسی کے معاملے میں وہ بہت زیادہ انصاف نہیں کر سکے ہیں اور یہ ہی وجہ ہے کہ فن نقد کی دنیا میں ان کو فارسی ادبی نقد کے بنیاد گزار کی حیثیت سے متعارف تو ضرور کرایا جا سکتا ہے لیکن اس صنف میں ان کو بہت بلند اور عالی درجہ پر فائض کرنا تھوڑا دشوار ہے کیونکہ ان کے یہاں چند مقامات کو چھوڑ کر زیادہ تر مواقع پر فن نقد کے اصولوں سے انحراف ہے، لیکن منیؔر لاہوری کی یہ کوشش اس لحاظ سے قابل ستائش اور لائق احترام ہے کہ انہوں نے پہلی بار اہل ہند کو احساس ہزیمت کے تاریک گڑھے سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور انتقادی نقطہ نظر سے اہل زبان کی شاعری کا معائنہ اور محاسبہ کیا ہے اور ان کے کلام میں پائی جانے والی لفظی ومعنوی اغلاط ولغزشوں کی نشان دہی کر کے اہل ہند کے احساس کم تری کو فرو کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے میں کامیابی پائی ہے کہ محض اہل زبان ہونے کی بنا پر کسی شاعر کو عظیم اور اغلاط سے مبرا قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی کسی فنکار یا دانشور کی تخلیقی قوتیں کسی زبان یا علاقے کی پابند ہیں لہٰذا یہاں کے فارسی گو شاعروں اور ادیبوں کو اپنے اذہان سے ایرانیوں کی بے جا برتری کے خیال کو پوری طرح نکال دینا چاہیے اور اپنی تخلیقات کی عظمت وافادیت کو اہل نظر کے سامنے لانے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان پر فخر کرنا چاہیے۔

خان آرزوؔ اس لحاظ سے لائق تعظیم ہیں کہ انھوں نے ادبی نقد کی روائت کو آگے بڑھانے میں منیؔر کا بھرپور ساتھ دیا اور اس فن کو عروج پر پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، بھلے ہی دونوں کی فکر اور انداز میں یگانگت اور مشابہت نہ ہو، کیونکہ جب آرزو، منیؔر کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں تو بمقابلہ منیؔر ان کا لہجہ قدرے سنجیدہ، معتدل، نرم اور متوازن نظر آتا ہے ان کا آفاقی ذہن غیر جانبداری، بے تعصبی اور خیال وفکر کی شعوری آمیزش سے مربوط محسوس ہوتا ہے جو ان کی ناقدانہ آراء میں سنجیدگی، وقار، عظمت اور بالیدگی پیدا کر دیتا ہے حالانکہ ان کا رسالہ یعنی ''سراج منیر'' بھی ''کارنامہ'' ہی کی طرح زمانہ موجودہ کے نقدی اصولوں پر کھرا نہیں اُترتا ہے کیونکہ اس میں بھی فن نقد کے سائنٹفک اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تنقیدی نکات کو بروئے کار نہیں لایا گیا با این ہمہ اکثر مقامات پر جب وہ منیؔر کے اعتراضات وایرادات کا رد پیش کرتے ہیں تو ان پر موجودہ دور کے بہترین ادبی ناقد ہونے کا گمان گزرتا ہے اور نہ صرف بعد کے ناقدین نے ان کے پیش کردہ افکار ونظریات کی روشنی میں اپنے آگے راستے متعین کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ خود ان کے عہد کے شاعروں اور ادیبوں کے اذہان پر بھی ان کے ان رجحانات کے گہرے نقوش مرتب ہوئے تھے، ان رسالوں کے منظر عام پر آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب تنقید کا نشانہ بننے کے خوف سے، شاعروں اور ادیبوں کی فکر میں بیداری پیدا ہوئی، محض الفاظ کی غیر ضروری نمائش کو ترک کر کے معنوی اعتبار سے شعر وشاعری کی طرف توجہ دی گئی، نئے استعارات وتشبیہات، جدید تراکیب، تازہ بندشوں کی مدد سے شاعری میں جدت وندرت، سلیقہ وشائستگی، اور نیا رنگ وآہنگ پیدا ہوا، زبان وادب کو بندشوں اور کہنہ روائتوں سے رہائی ملی اور اس طرح فارسی زبان وادب جو روایات کی غلامی کے سبب اپنی سابقہ آب وتاب کھو رہا تھا اس میں از سر نو تابندگی اور درخشندگی نظر آ رہی تھی، اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان دوراندیش دانشوروں کی تحریروں نے ادب کی بہت خدمت کی، شاعروں میں دردست شعر کہنے کا شعور بالیدہ ہوا اور دانشوران ادب نہ صرف یہ کہ بذات خود محتاط ہوئے بلکہ عام قارئین کے سوچنے سمجھنے اور ادب سے متعلق اپنی آزادانہ وعادلانہ رائے پیش کرنے کا احساس بھی آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگا۔

رسالہ ''کارنامہ منیر'' میں جو اعتراضات وارد کیے گئے اور ''سراج منیر'' میں ملا منیؔر لاہوری کے ان اعتراضات کے جو، جوابات یا رد پیش کیے گئے ہیں

ان کا انداز وہی ہے جو عام طور پر اس عہد میں مستعمل تھا یعنی شاعروں کے کلام پر اظہار نظر کرتے وقت وہ ہی طریقہ تنقیص وتعریض بروئے کار لایا گیا ہے جو کسی مخصوص اصول وآئین پر مشتمل نہیں تھا بلکہ صرف ذاتی ذوق اور شخصی پسند و ناپسند کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان دونوں کتابچوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایرادات واعتراضات کارد پیش کرتے وقت دونوں ہی ناقد اپنے لہجے کی تندی وتلخی کو پوشیدہ رکھنے میں صدفی صد کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن ان کی تحریریں یہ ضرور بتاتی ہیں کہ دونوں ناقدین کی شعوری کوشش یہ ہی ہے کہ وہ اپنے لب ولہجے کو حتی الامکان نرم وملائم اور شائستہ ومتین رکھتے ہوئے اساتذہ کے کلام کی مخالفت یا مدافعت کریں اور دونوں ہی اپنی اس شعوری کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں بعض مواقع پر آرزو، منیرؔ کے ہم خیال بھی نظر آتے ہیں اور نہائت ایمانداری کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ منیرؔ لاہوری کی گرفت اپنی جگہ بالکل جائز اور درست ہے لیکن یہاں اس بات پر بھی نظر رکھی جائے کہ ایسا بہت کم جگہوں پر ہوتا ہے کہ خان آرزوؔ، منیرؔ کے ہم خیال ہو کر ان کی آواز سے آواز ملائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں لیکن اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان عالمانہ مباحث نے فارسی زبان وادب کو جو عروج بخشا ہے اس سے کوئی بھی صاحب نظر انکار کی جرات نہیں کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''کارنامہ'' اور ''سراج منیر'' ہمارے ملک کے فارسی داں دانشوروں کے ایسے عظیم ادبی کارنامے ہیں جن پر ہم لوگ جتنا بھی ناز وافتخار کریں اتنا ہی کم ہے ہمارے ناقدین ادب کے ان عملی اقدامات نے نہ صرف ان کے دوست واحباب، معاصرین وشاگردوں بلکہ آئندہ تشنگان علم کے لیے بھی غور وفکر کے نئے دریچے وا کیے ہیں ان کی تحریروں میں فن نقد سے متعلق جو نو کھے اور سودمند نکات پیش کیے گئے ہیں ان کی اہمیت وارزش آج اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اسی طرح قائم ودائم ہے بلکہ گزرتا وقت ان کی تحریروں کی افادیت کو مزید افزوں کرتا چلا جارہا ہے اور عصر حاضر کے جدید ناقدین ادب بھی ان بزرگوں کی تحاریر میں موجود مختلف نکات وجہات کو کشف کرنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ان دانشوروں کے علمی وادبی بحر ذخار سے کچھ موتی چن سکیں اور فارسی ادبی نقد کی تاریخ میں مزید استحکام اور استقلال پیدا کر سکیں۔

☆☆☆

## ماخذ ومنابع


۱۔ فرہنگ نویسی فارسی در ہندوپاکستان، ڈاکٹر شہریار نقوی، انتشارات ادارۂ کل نگارش وزارت فرہنگ، چاپ خانہ دانش گاہ تہران، ۱۳۴۱، صفحہ نمبر دوازدہ۔

۲۔ مجمع النفائس، سراج الدین علی خان آرزو تصحیح وترتیب ڈاکٹر زیب النساء، ایس، ٹی پرنٹرز راولپنڈی ۲۰۰۴ء، صفحہ نمبر ۲۷۔

۳۔ سراج منیر، سراج الدین خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷، صفحہ نمبر ۴۴۔

۴۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۴۔۵۔

۵۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۹۔

۶۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۹۔

۷۔ سراج منیر، سراج الدین علی خاں آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷، صفحہ نمبر ۳۹۔

۸۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۰۔

۹۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۱۔

۱۰۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷، صفحہ نمبر ۴۳۔

۱۱۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۵۔

۱۲۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۵۔۱۶۔

۱۳۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۵۴۔

۱۴۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۷۔

۱۵۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۷۔

۱۶۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۵۸۔

۱۷۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۱۹۔

۱۸۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۴۔۵۔

۱۹۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۶۴۔

۲۰۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۰۔

۲۱۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۰۔

۲۲۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۶۵۔

۲۳۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر۔۲۳

۲۴۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۳

۲۵۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۷۰۔

۲۶۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر۔۲۳

۲۷۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۳۔

۲۸۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۷۲۔

۲۹۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۵۔

۳۰۔ کارنامہ، منیر لاہوری، مقدمہ، تصحیح وتحشیہ، سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۲۵۔

۳۱۔ سراج منیر، سراج الدین علی خان آرزو، مقدمہ تصحیح وتحشیہ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، جدید اردو ٹائپ پریس چیمبر لین روڈ لاہور ۱۹۷۷ء، صفحہ نمبر ۷۷۔



**Dr. Neelofar Hafeez** (Assistant Professor Persian)

Department of Arabic & Persian

University of Allahabad, Prayagraj, UP, India 211002.

Mobile No. 7500984444

# اخبار کے فوائد

اخبار سے مراد وہ خبر نامہ ہے جس میں روزمرہ کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔اخبار کی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً ہر روز شائع ہونے والے اخبار کو ''روزنامہ'' ہفتہ میں ایک شائع ہونے والے کو''ہفتہ روزہ'' اور دو ہفتہ بعد شائع ہونے والے اخبار کو''پندرہ روزہ اخبار'' کہتے ہیں۔لیکن عام طور سے اسی کو اخبار کہا جاتا ہے جس میں یومیہ خبریں شائع ہوتی ہیں۔اخبار میں ملک و بیرون ملک کی وہ اہم خبریں شائع ہوتی ہیں۔جو گزشتہ چوبیس گھنٹے کے اندر واقع ہوتی ہیں۔آج کے دور میں اخبار کی بہت اہمیت ہے کیوں کہ دنیا سمٹ کر ایک کنبہ کے مانند ہوگئی ہے ایک دوسرے کے دکھ درد سے واقفیت رکھنا اور ہنگامی حالات میں مدد کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے اخبار کا مطالعہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بہت مفید ہے۔

اخبار پڑھنے والوں کو دنیا میں ہونے والے واقعات، حادثات، سیاسی نظریات، ملکی انقلابات، سائنسی ایجادات اور موسمیات وغیرہ کی اطلاعات ہر روز ملتی رہتی ہیں۔اس کے علاوہ بڑے بڑے رہنماؤں، مدبروں، سائنس دانوں اور ماہریں، تجارت کے خیالات اور ان کے تجربات وغیرہ سے آگاہی ہوتی ہے۔دنیا کی ہر مشہور ومقبول زبان میں مختلف ناموں سے بہت اخبارات شائع ہورہے ہیں۔کچھ اخبارات تو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔جو اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں۔

اخبارات کی اہمیت پچھلے چند سال پہلے تھی آج نہیں ہے گلی کے پرنگڑ پر چاہے وہ کسی بھی ذات کا ہو صبح سویرے اخبار کا مطالعہ کرتا نظر آتا تھا۔گھنٹوں اخبار کی خبروں پر بحث ہوتی تھی۔ پر کوئی اپنی اپنی رائے پیش کرتا تھا۔یوں سمجھئے کہ لوگ ناشتے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے جتنی کہ اخبار کو۔ایک دن اخبار دیر سے مل جائے تو ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔انگریزی یا دوسری زبانوں کے ساتھ اردو اخبارات کی بھی کثیر تعدادیں نکاسی ہوتی تھی خصوصی شمارے ہوتے تھے۔اتوار کو ہفتہ بھر کی خبروں کا جائزہ خصوصی سپلیمنٹ' سنڈے ایڈیشن ہوتا تھا۔ہفتہ بھر اخبار پڑھنے کی جن کو فرصت نہیں ہوتی تھی وہ اسی دن کے اخبار کا مطالعہ کرتے تھے۔اخبار کی اپنی ایک علاحدہ پالیسی اور لکھنے والے ہوتے تھے۔جنکے انداز تحریر سے کارئیں متاثر ہوتے تھے۔

اخبارات کے شیدائیوں کو صبح سویرے ہی اس کی طلب بے چین کر دیتی ہے۔اخبار کاروباری اصحاب کی جان ہے۔پروپگنڈے کا زمانہ ہے۔

چنانچہ تجار اخبارات کے ذریعہ اپنے یہاں کے مال کو خوب مشتہر کرتے ہیں۔اخبارات میں صرف خبریں ہی نہیں ہوتیں بلکہ شادی بیاہ،گم شدہ افراد،ملازمت،ادویات،موسمیات،مختلف قسم کے اشتہارات اور بازار کے تازہ ترین نرخ وغیرہ سے متعلق بھی تفصیل اطلاعات درج ہوتی ہیں۔اخبار ہمارے لئے یقیناً رہبر کامل ہے۔آج کے شب و روز میں سیاسی اور تجارتی معلومات کے لئے اخبار کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔اخبار عوام اور حکومت کے درمیان ایک وکیل کا کام کرتا ہے۔اخبار کے ذریعہ مشاہیر کے اقوال اور ان کے نظریات کا پتہ چلتا ہے۔اسی کے ذریعہ سیاست کے حل طلب مسائل ،مخالف پارٹیوں کے خیالات ،مختلف طرح کی ایجادات اور اختراعات کا علم ہوتا رہتا ہے۔اخبار بینی سے مختلف ممالک کے باشندوں میں ایک وسرے کے لئے ہمدردی اور خلوص کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اسی لئے اخبار کو''ادیب دوست'' کہا گیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہر اچھی چیز میں کوئی نہ کوئی نقصان کا پہلو بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔اخبار بینی سے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ایسی خبریں جن کے مشتہر ہونے سے عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور امن وامان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔اخبار کے ذریعہ تیزی سے پھیل جاتی ہیں۔مثلاً قتل،ڈاکہ،اغوا، عصمت دری،فسادات وغیرہ سے متعلق خبروں کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ اخبارات بڑی تعداد میں فروخت ہوں۔اخبارات ملک دشمنی عناصر کے کارناموں اور ان کے پروپگنڈے کو پھیلانے میں آگ پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ایک قصبہ یا شہر کا معمولی سانادآن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہتا ہے۔اسی لئے تو کسی شاعر نے اخبار کے متعلق بہت خوب کہا ہے۔

شام ہوتے ہی چلیں گی آندھیاں
آج کا اخبار پڑھ کر دیکھ لو

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ نقصانات کے مقابلہ میں اخبار بینی کے بہت سے فوائد ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔بہتر تو یہ ہوتا کہ اردو داں طبقہ اردو اخبارات خرید کر پڑھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں۔اور اردو زبان کو فروغ ملتا ہے۔

☆☆☆

**ناظمہ بیگم**
ایم۔اے۔اردو............عادل آباد
رابطہ نمبر 9390957915

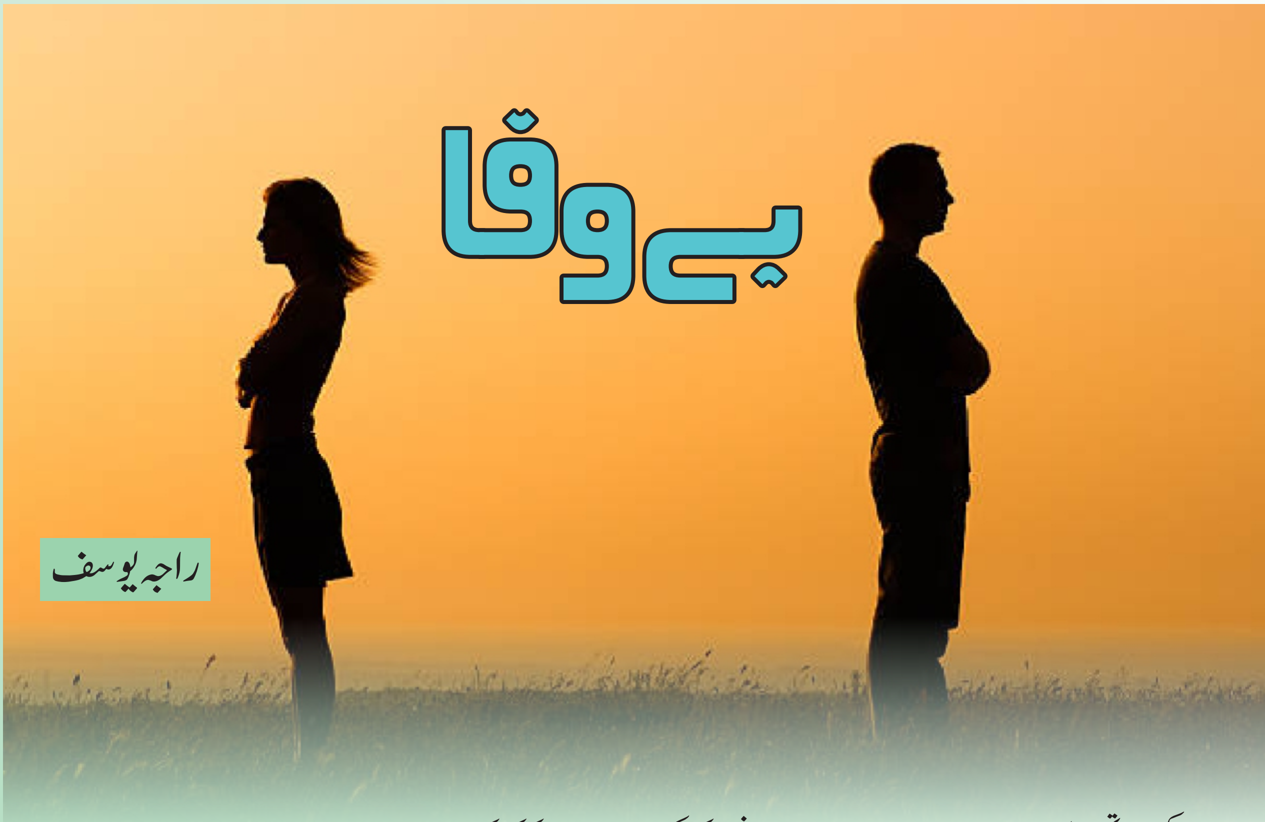

# بے وفا

راجہ یوسف

''دیکھو میں تمہیں کہہ چکا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا ........... نہیں کر سکتا۔''

''کس نے کہا آپ میرے ساتھ شادی کرو..........شادی تو میں آپ کے ساتھ کر رہی ہوں۔''

''دیکھو یہ پاگل پن ہے جو تم کر رہی ہو۔ اس سے باہر آجاؤ۔ پچھتاؤ گی۔''

''میں تو پچھتانے کے لئے ہی آپ کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پچھتانے دو نا مجھے پلیززززز۔''

''سمجھا کرو لڑکی۔ تم ابھی جوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ کوئی بھی نوجوان تمہارے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ تم خوشحال زندگی گزار سکتی ہو۔ میرے تو صرف دو سال نوکری کے بچے ہیں۔ پھر میں رٹائیر ہو جاؤں گا۔''

''سنئے سنئے۔۔۔ سنئے نا۔۔۔ آپ کی یہ باتیں تو میں کئی بار سن چکی ہوں۔ جانے کیوں محبت کے بیچ میں آپ اپنی عمر ڈال رہے ہیں۔ کیا میں نے کبھی آپ کو اپنی عمر کے بارے میں بتایا۔۔۔ نہیں نا۔ جب میری چھوٹی عمر ہماری شادی میں رکاوٹ نہیں بن رہی ہے تو آپ کیوں بار بار اپنی عمر کو لے کر محبت کا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔''

یوں تو لیاقت علی اٹھاون سال کا تھا لیکن وہ ابھی بھی چالیس بیالیس سال کا لگ رہا تھا۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ جن میں وہ کبھی بھی کوئی کلر نہیں کرتا تھا۔ چہرہ سرخ سفید۔ قد پانچ فٹ سات انچ اور جسم متناسب۔ آنکھیں روشن اور لہجہ نرم تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد لمبی تھی۔ جب سے سوشل میڈیا آیا تب سے اس کے دوستوں میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اب تو کئی خواتین کے ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ پانچ سال پہلے اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس کے دو بیٹے سرکاری ملازم تھے۔ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے شہر سے دور اپنی فیملیز کے ساتھ خوش تھے۔ کبھی کبھار ہی گھر آجاتے تھے یا کبھی چھٹیوں میں لیاقت علی ان کے پاس جاتا تھا۔ ویسے انہیں ایک دوسرے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

لیاقت علی کے گھر میں دو نوکر تھے جو گھر کی دیکھ بھال اور سیب کے باغات کی رکھوالی کرتے تھے۔ ویسے لیاقت علی آفس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت ایک اخبار کے دفتر میں گزارتا تھا۔ یہ اخبار اس کے ایک دوست کا تھا۔ جہاں وہ بلا معاوضہ اخبار کی معاونت کرتا تھا۔ وہاں اس کا اچھا وقت گزر جاتا تھا۔

سحرش چار پانچ مہینے پہلے اسے فیس بک پر مل گئی تھی۔ اس کی فرینڈ ریکویسٹ کنفرم کرتے ہی سحرش مسینجر پر بات کرنے لگی۔ پھر یہ سلسلہ رکا نہیں۔ یوں تو مسینجر پر لیاقت علی کی باتیں دنیا بھر کے لوگوں سے ہوتی تھیں جن میں خواتین کی بھی بڑی تعداد تھی لیکن سحرش نے آہستہ آہستہ لیاقت علی سے اس کی ذاتی معلومات حاصل کر لیں اور وہ فیس بک فرینڈ کم رہے اور ذاتی دوست زیادہ بن گئے۔ لیاقت علی کو بھی اس کے ساتھ باتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ وہ بڑی شائستہ اور علم دوست لڑکی تھی۔ اب یہ دونوں زیادہ تر فون پر بات کرتے تھے اور گھنٹوں کسی بھی موضوع پر رواں تبصرہ کر لیتے تھے۔ لیاقت علی کا مہینہ دو مہینے کے بعد دلی جانا ہوتا تھا۔ تو یہاں ان کو ملنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ سحرش فون پر جتنی بے باکی سے گفتگو کرتی تھی سامنے آ کر وہ اتنا ہی خاموش خاموش رہتی تھی اور صرف لیاقت علی کی سنتی تھی۔ دلی میں وہ ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔ تو ان کی دوستی آہستہ آہستہ پیار میں ڈھل چکی تھی۔ سحرش اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور ماس کام میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ یہ اس کا آخری سال تھا۔ پرنٹ میڈیا کے بارے میں وہ لیاقت علی سے بہت ساری مفید باتیں سیکھ چکی تھی اور ہمیشہ اپنی کم کہتی تھی اور لیاقت علی کی زیادہ سنتی تھی۔ لیاقت علی دہلی میں دو بار اس کے ساتھ اس کے گھر بھی گیا۔ جہاں اس کی ماں اور بہن بھائیوں سے ملاقات ہوگئی۔ اس دوران سحرش بھی ایک بار کشمیر آ گئی۔ اور لیاقت علی نے اسے پورا کشمیر دکھایا۔ کشمیر کے صحت افزا مقامات میں پہلگام اسے زیادہ پسند آیا۔ حالانکہ وہ گلمرگ گئی۔ برف پر سکیٹنگ کی۔ گنڈولا سے گلمرگ کی وادیاں دیکھ لیں۔ ڈل جھیل میں شکارے پر بیٹھ کر چار چناری، نشاط، شالیمار کی سیر کی۔ دو راتیں ہاؤس بوٹ میں بھی گذار دیں۔ ہارون، چشمہ شاہی۔ اچھ بل ویری ناگ دیکھا۔ مغل باغات کے ساتھ ساتھ وہ ساری نئی جگہیں بھی دیکھ لیں جو گھومنے کے لائق تھیں۔ سارا کشمیر گھومنے کے بعد بھی جانے اسے پہلگام زیادہ اچھا کیوں لگا۔ یہ تو باتوں باتوں میں اسے بعد میں پتا چلا کہ پہلگام لیاقت علی کی بھی پسندیدہ جگہ ہے۔ وہ پہلگام کو پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اسے پہلگام کے ساتھ عشق تھا۔ عشق کی بات آ گئی تو سحرش نے برا مان لیا۔ وہ چاہتی تھی کہ لیاقت علی عشق صرف اسی کے ساتھ کرے۔ کوئی تیسرا ان کے پیار کے بیچ نہ آئے۔ چاہے وہ دنیا کی حسین ترین جگہ پہلگام ہی کیوں نہ ہو۔

دونوں نے دلی اور کشمیر میں کتنے دن ساتھ گزارے۔ عشق اور عاشقی کی ہزار ہا باتیں کیں۔ کشمیر کی پھولوں بھری وادیوں اور یہاں کے سبزہ زاروں۔ لالہ زاروں اور آبشاروں نے سحرش کے انگ انگ میں عشق و مشک کی مستی بھر دی۔ وہ لیاقت علی کو جب بھی دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا جاتا تھا مگر کیا مجال کہ دونوں میں سے ایک نے بھی دوسرے کا جسم حاصل کرنے کی سوچی ہو۔ وہ دونوں تو دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کی چاہتوں میں گم تھے۔ بس کشمیر سے جاتے وقت ایرپورٹ پر الوداعی کلمات میں سحرش نے صرف اتنا کہا تھا

''میں بہت جلد آپ کے ساتھ شادی کروں گی۔''

''کیا۔۔؟'' لیاقت علی جیسے اس اچانک حملے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔

''یس۔۔۔آئی مین اٹ۔۔۔''

اس کے بعد جب وہ فیس بک یا فون پر بات کرتے تھے تو سحرش ایک ہی رٹ لگائے رہتی تھی کہ وہ شادی کب کر رہے ہیں؟

لیاقت علی نے اسے کئی بار سمجھایا۔ دنیا کے رسم و رواج بتائے۔ سماجی خوف و ڈر کی دہائی دی۔ لیکن سحرش ایک بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔

حالانکہ لیاقت علی کو سماج کی زیادہ پرواہ بھی نہیں تھی اور نہ اسے اپنے بیٹوں سے کوئی ڈر تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سحرش اور اس کی عمر میں چوبیس پچیس سال کا فرق تھا۔ جو اچھی بات نہیں تھی۔

''کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہو۔ میں تمہیں کیا دے پاؤں گا۔ میری ملازمت کے صرف دو سال بچے ہیں۔۔۔ پھر

''پھر کیا۔ پھر تو زیادہ آرام کی زندگی ہوگی۔ نہ آفس کی پریشانی، نہ کہیں آنے جانے کی جھنجٹ۔ پھر تو موجاں ہی موجاں ہے۔''

''پاگل۔۔۔ جب رٹائرمنٹ کی زندگی شروع ہوگی۔ اس کے بعد میں تمہارا کتنا ساتھ دے پاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال۔''

''ووووو۔۔۔دس بارہ سال۔۔۔ یہ تو بہت بہوووت ہیں۔ میں تو یہ مان کے چلتی ہوں ''سو برس کی زندگی سے اچھے ہیں۔ پیار کے دو چار دن۔''

''یہ کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ پھر کیا کرو گی

یہ پہاڑسی زندگی لے کر۔''

''میں تو چاہتی ہوں کہ تم سوسال سے بھی زیادہ جیو۔ پھراس میں سے تمہاری جتنی مرضی مجھے اتنا ہی وقت دے دینا۔دس سال۔۔۔ میں تو بس سال دوسال مانگتی ہوں۔وہ بھی مل جائیں تو بہت ہیں۔''

پھرلیاقت علی کی ایک نہ چلی اور سحرش کے ساتھ شادی کرلی۔وہ لیاقت علی کی ایک ایک بات کا خیال رکھتی تھی۔جس میں اس کی خوشی ہوتی وہی اپنے لئے بھی خوشی بنالیتی۔لیاقت علی کو کچھ سوچنے کی مہلت بھی نہیں مل رہی۔ابھی اس کے دل میں کوئی خیال سر ہی اٹھاتا تھا تو سحرش اس کی تکمیل میں کھڑی ہوتی تھی۔لیاقت علی کو ساری زندگی میں اتنی خوشیاں نہیں ملی تھیں جتنی سحرش سے اسے اس ایک سال میں ملی تھیں۔کبھی کبھی لیاقت علی کو لگتا تھا کہ سحرش کچھ تھکی تھکی سی لگتی ہے تو یہی سوچتا تھا کہ دہلی کی لڑکی ہے اور پڑھائی لکھائی میں بزی رہی ہے۔شاید بہت زیادہ گھریلو کام خود کرنے سے تھکتی ہے یا کشمیر کی آب وہوا کا فرق پڑا ہے۔وہ بار بار اسے کام کرنے سے روکتا تھا،اور گھر کے نوکروں سے کام کرانے کے لئے کہتا تھا،لیکن سحرش کو لیاقت علی کے سارے کام خود کرنے میں مزا آتا تھا۔

ایک دن لیاقت علی صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ سحرش چائے کی ٹرے لیکر آ گئی۔ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھتے ہی وہ دوسرے صوفے پر گر گئی۔حالانکہ اس نے خود کو کافی سنبھالا تھا۔صوفے کا بازو پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔لیکن وہ پھر بھی ایک طرف لڑھک گئی تھی۔لیاقت علی جلدی سے اٹھا،سحرش کو آوازیں دیں لیکن وہ ہوش میں نہیں تھی۔نوکروں کی مدد سے وہ اسے ایک بڑے اسپتال میں لے آیا۔

پرائیوٹ اسپتال میں سحرش کو کئی گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔تب تک ٹسٹ کرانے کے لئے اس کے کئی بار بلڈ سیمپل لئے گئے۔لیاقت علی یہاں سے وہاں دوڑتا رہا۔کچھ قریبی دوست بھی آ گئے تھے۔لیکن شام تک وہ لوگ بھی چلے گئے جب سحرش کو پوری طرح سے ہوش آیا۔وہ اکیلا ہی تھا۔اب خود ہی سحرش کے ٹسٹ جمع کر رہا تھا۔اور لگاتار ڈاکٹروں سے مل رہا تھا۔آخر وہ ٹسٹ اور ضروری کاغذات کا پلندہ لیکر تھکا ہارا سحرش کے بیڈ کے قریب آ گیا۔سحرش نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر لیاقت علی کو دیکھنے لگی۔لیکن لیاقت علی اس کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے پایا۔وہ ایک ٹک سحرش کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم جانتی تھیں؟۔''

''ہاں۔۔۔''سحرش نے مختصر جواب دے دیا

''کب سے؟''

''جب میں کشمیر آئی تھی۔اور جاتے وقت آپ کو شادی کا پرپوزل دیا تھا۔''

''کیوں کیا ایسا تم نے۔''

''میں زندگی کے یہ آخری پل آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ان کو حسین بنانا چاہتی تھی۔مجھے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ ایک سال اور جی پاؤں گی۔۔۔لیکن دیکھونا،تمہارا پیار مجھے دوسرے سال میں لے کر آ گیا۔شاید ابھی کچھ اور دن جیوں تمہارے ساتھ۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔لیاقت علی کے ہونٹ بند تھے۔لیکن اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی تھی۔

''نہ۔۔۔نہ۔۔۔نہ۔۔۔'' سحرش نے اپنی لرزتی انگلیوں سے اس کے آنسوں صاف کرنے کی کوشش کی۔لیاقت علی نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔اب سحرش کے ضبط کا بھی باندھ ٹوٹ چکا تھا۔وہ زور زور سے رو رہی تھی۔اور لیاقت علی اسے سینے سے لگا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔روتے روتے سحرش کی ہچکی بندھ چکی تھی۔

''دیکھونا مجھے کتنا اعتبار تھا تم پر۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں مروں گی تو تمہاری ہی بانہوں میں مروں گی۔''

''بے وفا۔۔۔سچ کہتے ہیں کہ یہ لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں۔ وقت ضرورت پر ہی دھوکہ دیتی ہیں''

سحرش اپنا چہرہ لیاقت علی کے سینے کے ساتھ رگڑ رہی تھی۔اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔لیکن معصوم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

**Raja YousufAnchidora.**
AnantnagKashmir.
1921019419734234
7006966876

# دہلیز

ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ

آج برسوں بعد اپنے بچپن کی ان گلیوں سے گذر رہوا۔آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا گلے میں ۔ماضی کی یادوں کی فلم سی چلنے لگی ۔اماں بابا اپیا چھوٹی بہن اور سب کی جان بھائی جان ، پتہ نہیں سب کی جان سمجھے جانے والے بھائی جان کو کیا ہوا کہ ان کی زندگی میں دولت شہرت نام کی ریل پیل تو ہوگئی مگر رشتے کہیں اس چکا چوند میں کھو سے گئے ۔

اپنی زندگی میں ماں بابا کو میں نے کبھی ایسا بے بس نہیں دیکھا تھا ۔وہ اپنے لاڈلے کے آگے پائی پائی کو محتاج تھے اور بیٹیوں سے نظر ملاتے گھبراتے تھے۔ان حالات میں میں نے ڈگری مکمل کرتے ہی ملازمت کرنے کا تہیہ کرلیا۔اپیا کے بالوں میں چاندی بڑھنے لگی تھی ۔اور میں سوچ رہی تھی کہ ملازمت ملتے ہی اپیا کا گھر بساؤں گی ۔اور امی ابا کی جھکی نظروں کا مداوا کروں گی ۔

ملازمت کی تلاش میں بھاگ دوڑ جاری تھی اک دن میں تھکی ہاری گھر آئی تو بھائی جان کو بابا اماں کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔مجھ کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

’’چار جماعت کیا پڑھ لی گھر کی دہلیز پھلانگنے لگی ہو۔ماں باپ کی عزت کی پرواہ ہے تمہیں؟۔خبر دار گھر سے باہر قدم نکالا۔‘‘

’’تو کیا ہوگا ؟‘‘میری بھی آواز بڑھ گئی ’’دہلیز کے باہر قدم رکھا ہے دہلیز پھلانگی نہیں تا کہ دہلیز کی عزت بنی رہے۔تا کہ بڑی بہن ماں باپ کی دہلیز پر ہی بوڑھی نہ ہوجائے بلکہ اپنے گھر بار کی ہوجائے۔چھوٹی بہن گھر کی دہلیز کی عزت بنائے رکھے اور والدین اپنی ہی اولاد سے نظر ملاسکیں‘‘ اور اس کی آواز رندھ گئی۔

بھائی جان پیر پٹکتے باہر نکل گئے۔اس کے بعد گھر میں کبھی بھائی جان سے سامنا نہیں ہوا۔

مجھے ملازمت ملتے ہی اماں بابا میں جیسے جان لوٹ آئی ۔بیٹی کا پیسہ ان کو بنا کسی مانگ اور شرط کے ملنے لگا۔بابا اپنے ملنے جلنے والوں سے اپیا کی رشتے کی بات کرنے لگے۔اللہ کی مہربانی سے دو مہینوں میں اپیا اپنے گھر کی ہوگئی۔چھوٹی کو اچھے کالج میں داخلہ مل گیا۔اب سب خوش تھے۔میں بھی میں تو بہت خوش تھی ماں باپ کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔

بھائی جان کسی دوسرے شہر میں آباد ہو چکے تھے۔اور پھر ملازمت مجھے تبادلہ کے نام پر ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجتی رہی۔اور کسی کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں آئی۔ادھر کچھ دنوں میں چھوٹی کی شادی بھی اپنے ہی کلاس فیلو سے ہوگئی۔اماں ابا نے سکون کی سانس لی۔مگر پھر اماں ابا کی بیماریوں کے اخراجات بہنوں کے مطالبات سر ابھارنے لگے اور بہتر ملازمت کے خیال سے میں نے وطن کو خیر باد کہہ دیا۔

اپیا اور چھوٹی نے ماں بابا کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری لے لی اور میں پر سکون ہوگئی۔آج برسوں بعد وطن آنا ہوا تو گھر پر نظر پڑتے ہی یادوں کے بھنور میں کھوگئی۔گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو بھائی کا کہا یاد آ گیا اور بے ساختہ زبان سے نکلا میں تو دہلیز برسوں پہلے پھلانگ چکی تھی پھر یہ کون سا درد تھا جو آنکھوں کے راستے سے بہہ نکلا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر حسینی کوثر سلطانہ فلیٹ نمبر۱ ثانیہ پلازہ جوبلی بھٹ کل گیٹ اورنگ آباد مہاراشٹر
Mob: 7798266547

# کرب سوچ کا!

رئیس صدیقی

وہ ایک سرکاری دفتر کے اکاؤنٹ سیکشن میں کلرک تھا۔پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ ہیڈ کلرک بن گیا تھا۔وہ بہت خوش تھا کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد اسکی ترقی ہوگئی۔بیٹی کی پیدایش اسکے لیے مبارک ثابت ہوئی۔

دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد، وہ مزید ترقی پا کر سیکشن آفیسر بن گیا تھا۔اب جس ڈپارٹمینٹ میں اسکی تقرری ہوئی تھی، وہاں، پہلے سے کہیں زیادہ اضافی آمدنی کے مواقع میسر تھے۔وہ یہ سوچ کر بہت خوش تھا کہ اب وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو کسی بڑے کالج میں پڑھائے گا۔وہ خوش تھا کہ وہ انکو اعلیٰ تعلیم دلوائے گا، وہ خوش تھا کہ مالی اعتبار سے اسکا اور اسکے بچوں کا معیارِ زندگی بہتر سے بہترین ہوگا۔وہ خوش تھا کہ وہ اب اپنی دونوں بیٹیوں کو بڑا افسر بنائے گا۔

وہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ مختلف طریقوں سے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے لیے بچانے لگا اور اضافی آمدنی سے اپنے گھر کے لیے مہنگی اشیا جُٹانے لگا۔کچھ دنوں کے بعد اسنے ایک کار اور پھر گھر بھی خرید لیا۔اب اسکی زندگی آسودہ ہونے لگی تھی۔آسودگی تو حاصل تھی لیکن اطمینان اور سکون ندارت تھا۔

پہلے وہ آفس سے وقت پر سیدھے اپنے گھر پہونچتا تھا۔پہلی بیٹی کی پیدایش کے بعد تو وہ چار بجے کے بعد سے ہی بے قرار ہونے لگتا۔وہ بار بار دیوار پر آویزاں گھڑی پر نظر ڈالتا اور آفس کا وقت پورا ہونے پر، سیدھے اپنے گھر پہونچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی کو اپنی گود میں لیتا، اسکے ساتھ کھیلتا او اس طرح اسکی ساری تھکان دور ہو جاتی۔

مگر اب افسر بننے کے بعد، آہستہ آہستہ اسکی زندگی کا طرزِ عمل بدل گیا تھا۔اب وہ آفس ٹائم کے بعد اپنے چند خاص ساتھیوں کے ساتھ دیر تک بیٹھنے لگا۔اسکے ساتھی خصوصی قسم کی مہنگی شراب کے ساتھ اعلیٰ قسم کے بھنے کاجو اور بہترین قسم کے مختلف نمکین کا اہتمام کرتے۔دھیرے دھیرے یہ محفل تاش اور قماش بازی میں تبدیل ہوجاتی۔

اس محفل میں کوئی اپنی بیوی کا، تو کوئی اپنی سسرال کا، تو کوئی اپنے

بچوں کا، تو کوئی اپنی بہو کا، تو کوئی اپنے داماد کے قصے سناتا۔ ان قصوں میں درد، کرب، مایوسی، محرومی، شکایت، خواہش، آرزو اور امید کی تڑپ ہوتی!

اسی طرح وقت بہت تیزی سے گذر رہا تھا۔ اسکی بیٹیاں جوانی کی دہلیز پر قدم بڑھا رہی تھیں۔

اب کمار بھی اپنی بیٹیوں کی شادی کی فکر اور مستقبل میں تنہائی کے بارے سوچنے لگا تھا۔ وہ کہتا کہ ماں باپ اپنی پوری زندگی اپنی بیٹی کے لیے جیتے، انکو اعلیٰ تعلیم دلواتے، افسر بنانے کا خواب پورا کرتے اور کسی اچھے گھر، اچھے شوہر کے لیے فکر مند رہتے۔

ایک وقت ایسا آتا کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جاتی اور ماں باپ اکیلے رہ جاتے۔ ایسے میں ایک بیٹے کی کمی محسوس ہوتی ہے جو اسکے ساتھ رہے، اسکے بڑھاپے میں اسکا ساتھ دے۔ وہ اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ خوش گوار بڑھاپا گذارے۔

ایسے موقع پر اسکے ساتھی مشورہ دیتے کہ ابھی بھی بیٹے کے لیے کوشش کر سکتے ہو۔ اس پر وہ اپنا مشاہدہ ساجھا کرتے ہوئے بتاتا کہ میں نے ایسے کئی گھر دیکھے ہیں، جہاں بیٹے کی چاہت میں چار۔ چار بیٹیاں پیدا ہو گئیں اور ماں باپ کسی کے ساتھ بھی وہ انصاف نہ کر سکے، جو انکا حق تھا۔

یہ سن کر، اسکا دوسرا ساتھی تسلی دیتے ہوئے کہتا کہ آج کل بیٹی۔ بیٹے میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ بیٹی بھی نام کماتی ہے اور کسی بیٹے کی طرح ہی، بیٹی بھی خیال رکھتی ہے۔

کمار ہوں کہتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کرتا:

لیکن میں اپنی بیٹی کے گھر میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بار بار اپنا گھر چھوڑ کر ہماری سیوا کے لیے آئے اور وہ دو گھروں کے درمیان، کسی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستی رہے۔

اسکا تیسرا ساتھی اسے یاد دلاتا کہ بوڑھے ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔

کمار کسی فلسفی کی طرح اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کرتا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وقت بہت تیزی سے گذر گیا۔ ہمارے بڑھاپے کا وقت بھی بہت جلد آ جائے گا۔ میں نے کئی بڑے بڑے افسروں کو دیکھا کہ انکا بڑھاپا گھور تنہائی میں گذر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے انکی یہ تنہائی نفسیاتی بیماری میں بدل گئی۔

میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ اگر میری بیوی مجھ سے پہلے اس دنیا سے چلی گئی تو میرا کیا ہوگا۔ میں تنہا نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی بیٹی، اپنے داماد کے گھر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ ایسی صورت میں میرا کیا ہوگا؟

یہ کہتے ہوئے وہ سنبھل کر اٹھتا، اپنی کار کی طرف بہکے قدموں کو جما کر رکھتا، کار چلاتے وقت سڑک کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر کے دروازہ تک پہونچتا۔

یہ اسکا روز کا معمول بن گیا تھا۔

درحقیقت، اب اسکی سوچ کا یہ کرب، اسکی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا تھا!

............☆☆☆............

(افسانہ نگار آکاشوانی و دوردرشن دلی/بھوپال کے سابق آئی بی ایس افسر، ساہتیہ اکادمی قومی ایوارڈ و دلی اردو اکادمی ایوارڈ سے سرفراز بیس کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم، شاعر، ادیب اطفال اور افسانہ نگار ہیں)

**RAIS SIDDQUI**
Mob: 9810141528
Email : rais.siddiqui.ibs@gmail.com:
(Ex IBS Officer AIR/DD)
Bungalow No. 2-RAHAT KADA,
14-GREEN VALLEY ENCLAVE,
AIRPORT ROAD, BHOPAL-462030
(MADHYA PRADESH, INDIA)

عابد حسین راتھر

# شمع ابھی باقی ہے!

کمرے کے کونے میں رکھی میز پر بند لائٹ اور گرد آلود کتابیں شازیہ کی زندگی کا آئینہ تھیں۔ ایک زمانہ تھا جب وہ انہی کتابوں کے ساتھ جیتی تھی اور اب وہی کتابیں بند ہو چکی تھیں... جیسے زندگی نے اپنا مقصد کھو دیا ہو۔ وہ کتابیں جو کبھی شازیہ کی تشنگی کو بجھانے کا کام کرتی تھیں اب ان کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی تھی۔

شازیہ، دو بچوں کی ماں، گزشتہ دس برس سے وادی کے مختلف گورنمنٹ کالجوں میں بطور عارضی لکچرر کام کر رہی تھی۔ ہر سال کنٹریکٹ کی تجدید کے ساتھ امید کی کرن پیدا ہوتی اور ہر سال اس کے ختم ہونے پر مایوسی کی سیاہی گہری ہو جاتی۔ اسے بارہا کہا گیا کہ آپ قابل ہیں، محنتی ہیں، مگر اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں مستقل پوسٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے کبھی شکایت نہیں کی کیونکہ پڑھانا اس کے لیے نوکری نہیں بلکہ ایک مقدس فرض تھا۔ ایک ایسا فریضہ جو اس کی روح کو تقویت اور دل کو تسکین فراہم کرتا تھا۔

مگر اس سال جب کنٹریکٹ ختم ہوا تو اسے خاموشی سے دروازہ دکھا دیا گیا۔ بغیر شکریہ، بغیر الوداع۔ کالج کی عمارت سے نکلتے وقت اس نے آخری بار مڑ کر دیکھا۔ ایک بار پھر دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا مگر کوئی آواز نہیں آئی۔

ایک بار پھر سے کالجوں میں پڑھانے کیلئے درخواستیں طلب کی گئی۔ ایک بار پھر سے امیدواروں کو ایک سال کیلئے عارضی طور پر کالجوں میں پڑھانے کیلئے تعینات کیا گیا۔ لیکن اس بار شازیہ کا نمبر نہیں آیا۔ میرٹ لسٹ میں زیادہ نمبرات کی وجہ سے نئے امیدواروں نے شازیہ کی جگہ لے لی۔ اس کے بعد جیسے زندگی رُک گئی۔ کچن، بچوں کی کاپیاں، دھلائی، صفائی... مگر دل کہیں نہیں لگتا تھا۔ شازیہ کی زندگی ایک بند گلی جیسی ہو گئی جہاں آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں، اور پیچھے پلٹنے کا کوئی جواز نہیں۔ گھر میں بیٹھنے کی وجہ سے شازیہ کے دل میں ایک چبھن سی اٹھی جس نے اس کے سکون کو چھین لیا۔ اس کے دو چھوٹے بچوں کی آنکھوں میں ہر وقت ماں کی مسکراہٹ تلاش رہتی تھی، مگر شازیہ کے چہرے پر اب اکثر خالی پن اور تھکن کا سایہ ہوتا۔

چند ہفتوں بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کو دوبارہ زندہ کرے گی۔ وہ ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں بطور استانی شامل ہو گئی جہاں تنخواہ برائے نام تھی۔ بچوں کی معصوم باتیں، چیخ پکار، تختی پر چاک کی آواز... ان سب میں اسے زندگی کی تھوڑی تھوڑی رمق دکھائی دینے لگی۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش تھی کہ کم از کم وہ پھر سے پڑھا رہی ہے۔

مگر یہ خوشی بھی کم معاوضے کے ساتھ زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکی۔ مہینے کے آخر میں جب بجلی کا بل، بچوں کی فیس، راشن کی فہرست اور گھر کے باقی اخراجات کی لسٹ ہاتھ میں آتی تو اس کی آنکھوں میں وہی پرانی بےبسی اتر آتی۔ بالا؟ خر مجبوری نے جذبے کو شکست دی اور اس نے استعفادے دیا۔ یہ فیصلہ اگرچہ اس کے لیے آسان نہ تھا، لیکن حالات نے اس کے ارادے کو توڑ دیا۔

اب وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتی۔۔۔کبھی تھکن کا بہانہ، کبھی بخار، کبھی دل کا بوجھ۔ بچوں کو اسکول بھیج کر وہ بس چھت کو گھورتی رہتی۔ دل میں مسلسل ایک خالی پن تھا۔ ایسا خلا جسے کوئی دوا، کوئی نیند، اور نہ ہی کسی کی بات بھر سکتی تھی۔ ایسے ہی ایک دن دوپہر کے وقت جب سورج باہر جھلسا رہا تھا اور شازیہ بستر پر بیجان سی لیٹی تھی، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ چونکی نہیں۔ بس سوالیہ انداز میں پکارا: " کون؟"

دروازہ آہستہ سے کھلا، اور بارہ تیرہ سال کی ایک دبلی پتلی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ گھبرا رہی تھی، جیسے کسی مقدس مقام پر بغیر اجازت آ گئی ہو۔

"میڈم شازیہ؟ " اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جی؟ تم کون ہو؟"

"میں فاطمہ ہوں، آپ کے اسکول سے ... وہ... آپ ہمیں اردو پڑھاتی تھی۔ کل یوم استاد پر اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ میری مدد کریں، کچھ لکھ دیں"...

شازیہ نے پلکیں بند کیں۔ دل جیسے کسی بوجھ کے نیچے دبا ہو۔ "بیٹا، میں بیمار ہوں... تھکی ہوئی ہوں... معذرت، ابھی ممکن نہیں۔"

فاطمہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ " ٹھیک ہے، میڈم۔" وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ جوتوں کی چاپ کمرے سے دور ہونے لگی۔

شازیہ نے کروٹ بدلی۔ ایک پل کے لیے دل میں خاموشی چھا گئی، پھر جیسے کسی نے اندر سے دستک دی:

"تم نے برسوں علم بانٹا... کیا اب تمہارے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں؟ جس کام کے لیے اللہ نے تمہیں چنا، اسے کیوں چھوڑ رہی ہو؟"

دروازہ تقریباً بند ہونے ہی والا تھا جب شازیہ کی آواز آئی:

"فاطمہ... رکو!"

لڑکی پلٹی، امید کی جھلک اس کی آنکھوں میں دوبارہ جاگ گئی۔

" آؤ بیٹا، بیٹھو۔ بتاؤ، موضوع کیا ہے؟"

"استاد کی اہمیت"... فاطمہ نے کہا۔

شازیہ کے ہونٹوں پر پہلی بار کئی دنوں بعد مسکراہٹ آئی۔ اس نے کاغذ اور قلم اٹھایا، اور لکھنا شروع کیا۔ جیسے برسوں کی تھکی ہوئی روح کو نئی توانائی مل گئی ہو۔ الفاظ اس کے اندر سے بہتے چلے آ رہے تھے۔ ہر جملہ جیسے اس کے دل کا ٹکڑا ہو۔

تقریر مکمل ہوئی، تو فاطمہ نے شکرگزاری سے شازیہ کا ہاتھ تھاما: "میڈم، آپ نے میرے لیے بہت بڑا احسان کیا۔"

شازیہ نے ہلکے سے سر ہلایا، لیکن دل میں ایک خوشبو سی پھیل گئی۔ وہ خوشی جو تنخواہ یا شہرت سے نہیں، کسی کو کچھ سکھانے سے ملتی ہے۔

دو دن بعد دوپہر کو شازیہ گھر کے کام میں مصروف تھی کہ اچانک کسی نے دروازے پر پھر سے دستک دی۔ شازیہ نے دروازہ کھولا تو فاطمہ ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"میڈم! میں جیت گئی!" اس نے خوشی سے چہک کر کہا، "پہلی پوزیشن!"

اس کے گلے میں تمغہ تھا، اور ہاتھ میں سرٹیفکیٹ۔ وہ دوڑ کر شازیہ کے قریب آئی، اور میڈل اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔

"یہ آپ کا ہے، میڈم۔"

شازیہ کے لبوں پر کپکپاہٹ پھیل گئی، آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ میڈل کو ہاتھ میں لے کر دیر تک دیکھتی رہی، جیسے برسوں بعد کسی نے اس کے

زخموں پر مرہم رکھا ہو۔

"بیٹا، یہ تمہاری محنت کا پھل ہے"...

"نہیں، میڈم... یہ آپ کا علم، آپ کی رہنمائی، اور آپ کا جذبہ ہے جس نے مجھے جتوایا۔"

شازیہ نے اسے گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مگر یہ آنسو اداسی کے نہیں تشکر کے تھے۔ برسوں کا درد، محرومی، بیقدری... سب ان آنسوؤں میں بہہ گیا۔ دل کا ایک بوجھ جیسے ہٹ گیا ہو۔ اس لمحے اسے یوں لگا جیسے رب نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا ہو اور کہا ہو:

"شازیہ، تم اب بھی قیمتی ہو... تمہارا علم اب بھی روشنی دے سکتا ہے۔"

اس لمحے شازیہ کو احساس ہوا کہ چراغ بجھنے سے پہلے بھی روشنی بانٹ سکتا ہے... اور شاید اسی روشنی سے کئی زندگیوں کے اندھیرے چھٹ سکتے ہیں۔ اس دن سے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پھر سے اپنے علم کی شمع جلائے گی، خواہ چھوٹے بچوں کو پڑھا کر، یا گھروں میں جا کر، یا فلاحی اداروں میں۔ کیونکہ کسی کو کچھ سکھانا، کسی کا مستقبل سنوارنا صرف روزگار نہیں، عبادت ہے۔

☆☆☆


**عابد حسین راتھر**

پتہ: سوپٹ دیوسر کولگام کشمیر

ای میل: rather1294@gmail.com

موبائیل نمبر: 7006569430

# غزل

توفیق فاخری

عدل گونگا ہے حکمراں چپ ہے
کیوں تشدد پہ یہ جہاں چپ ہے

لفظ خاموش اور بیاں چپ ہے
میری حالت پہ ہر زباں چپ ہے

شر پسندوں کا رقص ہے جاری
شہرِ دل کا جو پاسباں چپ ہے

گھیر رکھا ہے دشمنوں نے مجھے
ایسے عالم میں آسماں چپ ہے

اس قدر ہو رہے ہیں ظلم و ستم
شہر کا پیر اور جواں چپ ہے

عشق سر چڑھ کے بولتا ہے میاں
اہل حق کوئی بھی کہاں چپ ہے

ہم کو برباد کر کے چھوڑے گا
یہ جو توفیق حکمراں چپ ہے

از قلم: توفیق فاخری جلال پوری، ممبئی


**TAUFEEQ FAKHRI JALALPURI**
SABERAH MANZIL B/304
DONGRE LANE KISMAT COLONY
KAUSA MUMBRA,
THANE 400612MAHARASHTRA
Mob: 9768772034

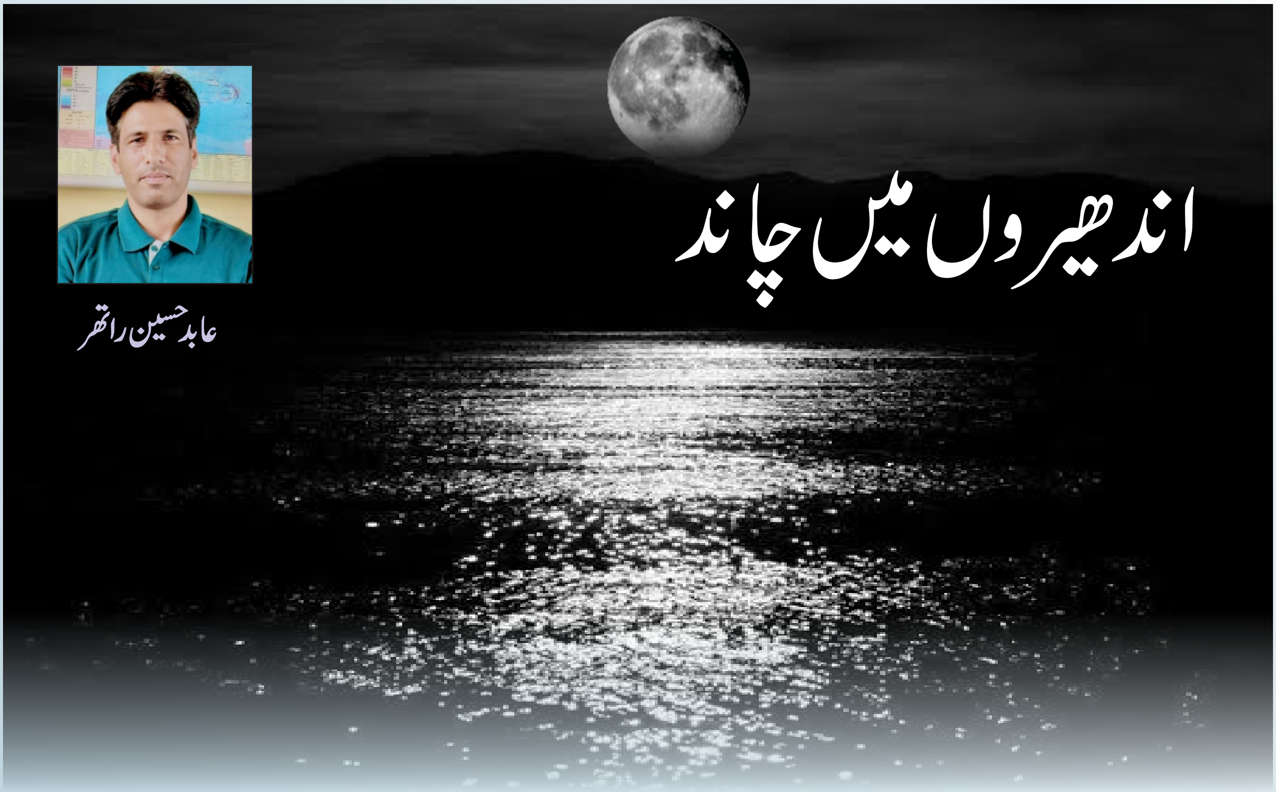

# اندھیروں میں چاند

عابد حسین راتھر

صبح کی ٹھنڈی ہوائیں کھڑکی سے اندر آ رہی تھی مگر عمیر کے دل کا بوجھ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر اس کے دستاویزات کی فائل رکھی تھی، جس میں ریاضی میں اول درجے کی پوسٹ گریجویشن اور بی ایڈ کی اسناد احتیاط سے کور کے اندر بند تھیں۔ کبھی کبھی وہ اس کور کو کھول کر اپنی ڈگریوں پر نظر ڈالتا اور پھر واپس بند کر دیتا جیسے کوئی انسان کسی گہرے زخم کی پٹی کو کھول کر اس سے کریدنا شروع کرتا ہے اور درد محسوس ہوتے ہی دوبارہ پٹی بند کر کے زخم کو چھپا دیتا ہے۔ بے روزگاری نے اس کی زندگی کو اجیرن بنا کے رکھا تھا۔ اس کی بہن بھی جوانی کی اُس دہلیز پر کھڑی تھی جہاں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو جایا کرتے ہیں، مگر اس کے ہاتھ اب تک سادہ تھے۔ اس کا باپ بھی بڑھتی عمر کے ساتھ نہایت کمزور ہو گیا تھا اور مزدوری کے قابل نہ رہا تھا۔ ماں کی زندگی اب بیماری اور دوائی کے بیچ جھولتی ایک کہانی بن چکی تھی۔ غربت نے اس گھر کو اپنا مستقل پتہ بنا رکھا تھا، جیسے اب اسے کہیں اور جانا ہی نہ ہو۔

عمیر کے والد صاحب اپنے کمرے کے ایک کونے میں تکیہ کے سہارے نیم دراز لیٹے کھانس رہے تھے۔ کھانسی کے دورے جیسے ان کے سینے میں بسی کسی پرانی کہانی کو باہر نکالنے کی ضد کر رہے تھے۔ کچن میں اس کی بہن چائے بنانے میں مصروف تھی۔ دودھ کے چھوٹے سے پیکٹ کو دیکھ کر وہ حساب لگاتی جا رہی تھی کہ یہ پیکٹ کتنے دن چلے گا۔ اس کی ماں قریب ہی بیٹھ کر کمزور ہاتھوں سے گھر کے کاموں میں اپنی بیٹی کا یوں ساتھ دے رہی تھی جیسے اپنی اداس اور ٹوٹتی سانسوں سے گھر کی بکھرتی دیواریں تھام رہی ہو اور عمیر اپنے کمرے میں اداس بیٹھا اس سوچ میں گم تھا کہ شاید اس کی ڈگری کا وزن اس کے خالی جیب سے زیادہ ہلکا ہے۔

"بیٹا،" ماں نے عمیر کے کمرے کے دروازے کے پاس آ کر دھیرے سے کہا، "کل تم شاید کسی اسکول میں گئے تھے نا... کوئی بات بنی؟"

عمیر نے نظریں جھکا کر کہا، "امی، بہت سارے اسکولوں کے چکر لگائے۔ بس وہی... بارہ پندرہ ہزار کی بات کرتے ہیں۔ اس میں گھر کیسے چلے گا؟"

ماں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔ کچن کی طرف پلٹتے ہوئے ان کی سانس بھاری ہو گئی۔

گھر کی خاموشی میں غربت کی چاپ اتنی واضح تھی کہ عمیر کو محسوس ہو رہا

تھا جیسے ہر دیوار یہ کہہ رہی ہے، کچھ کرو، ورنہ سب ٹوٹ جائے گا۔

اگلے دن وہ فائل بغل میں دبائے دوبارہ شہر کے مختلف پرائیوٹ اسکولوں کے چکر لگانے لگا۔ کچھ جگہ خوش اخلاقی سے انٹرویو لیا گیا، کچھ جگہ صرف ایک نظر دیکھ کر کہا گیا، "ہم آپ کو اطلاع دیں گے" لیکن وہ اطلاع پھر کبھی نہیں آتی۔ ہر بار جب تنخواہ کی بات ہوتی، وہی ایک جملہ سننے کو ملتا:

"بارہ ہزار"...

"پندرہ ہزار"...

اور عمیر سوچتا، یہ کیسا مذاق ہے؟ تعلیم کا یہ صلہ؟ آج بھی دن بھر کسی پرائیوٹ اسکول میں نوکری ڈھونڈنے میں ناکامیابی کے بعد وہ شام کو تھکا ہارا گھر کو واپس لوٹا۔ شام کا کھانا کھاتے وقت اس سے ایک نسبتاً بڑے اسکول سے کال آئی۔" کل صبح دس بجے آ جائیں، انٹرویو ہے۔"

وہ رات بھر سو نہ سکا۔ دل میں امید کی چنگاری پھر سے روشن ہوگئی۔

اگلی صبح وہ پوری تیاری کے ساتھ اسکول پہنچا۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے مسکرا کر کہا:

"آپ عمیر صاحب ہیں نا؟ پرنسپل صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

عمیر پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا تو قالین کی خوشبو، میز پر تازہ پھول اور کمرے میں ہر چیز کی ترتیب نے اسے ایک لمحے کو مطمئن کر دیا۔ انٹرویو رسمی سوالات سے شروع ہوا۔ پرنسپل صاحب نے عمیر سے مختلف سوالات پوچھے اور عمیر نے اطمینان کے ساتھ ہر سوال کا صحیح جواب دیا۔ آخر میں پرنسپل صاحب نے پوچھا:

"تو عمیر صاحب، آپ کی توقعات کیا ہیں تنخواہ کے حوالے سے؟"

عمیر نے ہمت کر کے کہا:

"سر، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنا کام کروں گا۔ لیکن میرے کاندھوں پر گھر کی ساری ذمہ داریاں زیادہ ہیں... کم از کم پچیس ہزار کی امید رکھتا ہوں تاکہ میرا بھی گزارہ ہو۔"

پرنسپل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، "پچیس تو ذرا زیادہ ہیں... لیکن دیکھیں، بیس یا بائیس تک ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ میں اسکول منیجمنٹ کمیٹی سے بات کر کے آپ کو فون پر اطلاع دوں گا۔"

عمیر نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اس بار اسے لگا جیسے قسمت واقعی ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے گھر والوں کو خوشخبری سنا دی اور وہ بھی مطمئن ہو گئے کہ اس بار شاید قسمت ان کا ساتھ دے گی۔

دس دن گزر گئے۔ پھر پندرہ۔ مگر کوئی فون نہ آیا۔ آخر کار اس نے خود پرنسپل کو فون کیا:

"سر، میں عمیر بول رہا ہوں، جس کا آپ نے ریاضی پڑھانے کے لیے انٹرویو لیا تھا... اسکول جوائن کرنے کے بارے میں کچھ اطلاع ملی؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر پرنسپل کی سرد آواز آئی:

"جی یاد آیا، عمیر صاحب میں معافی چاہتا ہوں لیکن کمیٹی نے ایک خاتون امیدوار کو رکھ لیا ہے۔ وہ دس ہزار ماہانہ تنخواہ پر راضی ہوگئی۔"

عمیر کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ "جی، ٹھیک ہے سر" کہہ کر فون بند کر دیا۔

کمرے میں واپس آ کر وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ ماں نے قریب آ کر پوچھا، "کیا ہوا بیٹا؟"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں، "کچھ نہیں امی... وہ جگہ کسی اور کو مل گئی۔"

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ سوچتا رہا—

کیا وہ خاتون مجھ سے زیادہ مجبور تھی؟ یا سمجھوتہ کرنے میں مجھ سے آگے؟ کیا ہماری ڈگریوں کی قیمت اب بس اتنی ہی رہ گئی ہے کہ مہینے میں دس ہزار کے عوض بک جائے؟ کیا یہ ادارے صرف ہمارے حالات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، یا ہم خود ہی اپنی قدر گھٹا بیٹھے ہیں؟ کھڑکی سے باہر چاند بادلوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ عمیر کو لگا وہ خود بھی اسی چاند کی طرح ہے، روشنی دینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اندھیروں میں گم۔

☆☆☆

**عابد حسین راتھر**

پتہ: سوپٹ دیوسر کولگام کشمیر

ای میل rather1294@gmail.com

موبائیل نمبر:7006569430

# کاش۔۔۔!

جمیل ارشد

راستہ سنسان تھا۔ ہر طرف عجیب ہیبت ناک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنی دھن میں اکیلا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ فوراً مڑا تو دیکھا کہ ایک زرد رنگ کا خونخوار کتا دبے پاؤں اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ کتے نے اسے مڑتا دیکھ بلند اور خوفناک آواز میں بھونکنا شروع کر دیا اس کا بھونکنا تھا کہ دکانوں کے چبوتروں اور گھروں کی سیڑھیوں کے نیچے سوئے ہوئے کتے بھی ہڑبڑا کر دانت نکوستے اور بھونکتے نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس بارہ غراتے اور بھونکتے تشدد پر آمادہ کتوں کا ہجوم اس کے اطراف جمع ہو گیا۔ خوف کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کتے اس سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے ان کی اچانک یلغار سے  وہ حواس باختہ ہو گیا اس کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کتے پوری شدت سے بھونک رہے تھے ان کے نکیلے اور پیلے دانت صاف دکھائی دے رہے تھے جو اس کے خوف میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ ماضی قریب میں ہونے والے کتوں کے ہجومی تشدد کے کئی واقعات اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے جن میں کئی لوگوں کو انہوں نے پھاڑ کر مار دیا تھا واقعات یاد آتے ہی اس کے رہے سہے ہوش بھی فاختہ ہو گئے اور سراسیمہ ہو کر اس نے فوراً دوڑ لگا دی اس کا دوڑنا تھا کہ کتوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ اس کی گھبراہٹ اور خوف کا فائدہ اٹھا کر اس کے پیچھے لپکے قریب تھا کہ وہ اس کو پکڑ کر اس کا حشر بھی پہلے لوگوں جیسا کر دیتے ؛ وہ بھاگتے بھاگتے اچانک رکا اور اس نے پتھر اٹھا لیا اس کے رکتے ہی کتے بھی دفعتاً اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے اس نے پتھر اس بڑے زرد کتے کے سر پر دے مارا جوان کا سردار تھا وہ بری طرح بلبلا کر ایک طرف کو بھاگا دوسرے کتوں پر بھی اس خوف زدہ لڑکے کے پلٹ وار کا خاطر خواہ اثر ہوا لڑکے نے مزید پتھر اٹھا لیے اور کتوں کی طرف پھینکے یہ صورتِ حال ان کے لیے غیر متوقع تھی جس کے لیے وہ تیار نہیں تھے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ جس کا جدھر رخ ہوا وہ ادھر دم دبا کر بھاگ  نکلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کتے ہوا ہو گئے اور میدان صاف ہو گیا۔

وہ تنہا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کاش پچھلے لوگ بھی ان بزدل کتوں سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے پتھر اٹھا لیتے!

جمیل ارشد خان کھام گانوی

رابطہ۔9503600264

کلام رفیق طاہر کاوٗچکی

# بچوں کی حفاظت

التجا میری ہے تم سے دوستو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
خاص نگرانی میں تم انکو رکھو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
ان کے ہیں اذہان ناپختہ غریب — یہ نہ دروازوں کے جا پائیں قریب
گیس ، بجلی اور پانی سے ڈرو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
بند رکھو تالوں سے تم الماریاں — کھل نہ آسانی سے پائیں کھڑکیاں
تم ڈھکو بجلی کے سب آلات کو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
ان پہ نظریں تم رکھو بس رات دن — یہ نہ کھائیں کنکری ، سکہ یا پن
دیدہ ور اس سلسلے میں تم بنو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
پالتو جو بھی یہاں ہیں جانور — پہنچ سکتا ہے انہیں ان سے بھی شر
سامنے ان کے نہ جائیں دیکھ لو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
فیس بک ان سے رکھو اب دور تم — نا کبھی اس میں بنو مغرور تم
کم سنی میں ان کو موبائل نہ دو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
نا نکالیں بائیک یہ ، یا کوئی کار — ہو نہ جائے حادثوں کے یہ شکار
نا ابھی گاڑی چلانے ان کو دو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
ہر طرح کی تم کرو جب احتیاط — شر سے تب بچوں کو مل سکتی نجات
خود بھی کر لوگوں سے بھی کہتے رہو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو
خود کرو پرہیز اور بچوں سے کہہ — ہر نشہ ہوتا ہے بس نقصان دہ
بات طاہر کی اگر سمجھی ہے تو — اپنے بچوں کی حفاظت خود کرو

نام محمد رفیق لون
قلمی نام رفیق طاہر کاوٗچکی
حال سرینگر کشمیر
فون نمبر 8899326100

# آزاد نظم

شاداں رفیق اوڑی

# اوڑی

یہ اُوڑی ہے وطن ہے سب کا یہ وادی
مکیں ہیں جو چمن ہے سب کا یہ وادی
کبھی تم دیکھ لو نا وادیِ اُوڑی حسیں کو بھی
ملو نا تم کبھی آ کر اُوڑی کے ہم مکیں کو بھی
سنو یارو اُوڑی کی شان کو اب میں سناتا ہوں
کیا کیا ہے یہاں پر خوبصورت سب دکھاتا ہوں
بسی کشمیر کے دل میں ہے یہ گھاٹی
یہاں مٹی چمکتی ہے پہاڑوں میں ہیں آئینے
ہوا میں عِطر سی خوشبو ہے گلیوں میں
گلابی پھول ہیں جیسے فضا میں گھومتے
یہاں کے گُل چمکتے ہیں دمکتے ہیں
مسرّت سے یہ ہم کو بھی ہنساتے ہیں
اِدھر سب شے جوانی ہے چمک پل پل روانی ہے
یہاں ہر روز آ کر شمس تو آرام دیتا ہے
قمر آ کر اندھیرے میں سکوں کا جام دیتا ہے
ہرے میدان کُھل کے مسکراتے ہیں

ندی دریا سنہرے گیت گاتے ہیں
یہ سڑکیں رستے منزل پل میں پُر کرواتے ہیں
ملے گاؤں ملی بستی ملے دل ہیں یہاں پر سب
ملے دریا ملے جنگل ملے گُل ہیں یہاں پر سب
پیارے رنگ ہیں جتنے وہ شامل ہیں یہاں پر سب
ہیں ایسے پاک دل انساں کہ بلبل ہیں یہاں پر سب
سنو شاداں، سنو یارو، سنو اک بات تو سن لو
یہاں بھی چار موسم ہیں سبھی کے یار موسم ہیں
دلوں میں عشق کے فنکار موسم ہیں
اگر ہو مسئلہ غم دل کا تو دلدار موسم ہیں
چمکتا چاند سورج ہے چمک دیتا ہے بادل بھی
یہاں آب و فضا کی بو مہک دیتا ہے صندل بھی
نسیمِ چین لے کر دیتا ہے خوشبو یہاں گُل بھی
جدھر دیکھو اُدھر چڑیاں چہکتی ہیں
ہرے ہیں پیڑ پودے دل سے صدمہ چھین لیتے ہیں
یہ دامن کی جو زُلفیں ہیں وہ جنگل نے سنواری ہیں
دوا غم کی ہوا ہے جو وہ جہلم نے بکھیری ہے
سکوں سی سردی لے کر پیر کی پنجال اُتری ہے
یہاں جھرنے یہاں دریا یہاں میداں یہاں جنگل
لِپٹ کے رہتے ہیں پربت سفیدی میں یہاں ہر دَم
بڑے چھوٹے سبھی پربت سیاہوں کے لیے آسی
یہاں کی بستی اکثر ہے پہاڑوں میں
بہت سی بولیوں کا گھر ہے یہ وادی
یہاں اردو پہاڑی گوجری ہیں اور کشمیری
یہ اڑتالیس گاؤں پر ہے اک چھائی ہوئی وادی
یہ بٹوارے میں سرحد پر حسیں آئی ہوئی وادی

سنا ہے، ہم نے ہے جنت سے یہ لائی ہوئی وادی
یہاں بادل لپٹ کر کوہ سے جو گشت کرتے ہیں
نظارہ دلکشی بن کر ہمیں بھی مست کرتے ہیں
پریشاں قلب کو اپنی ہی اور وابست کرتے ہیں
اُوڑی تجھ پر لکھوں تو تھک ہی جائیں گے قلم
حقیقت خوبصورت نام بھی تیرا حقیقت ہے
بیاں تجھ کو کروں تو سننے بیٹھے گی بزم
تیری اک بات سے سب رو پڑیں گے
سہے ہیں تو نے سرحد پر ستم کتنے
تجھے تاروں نے بھی تارا بتایا ہے
تری ہی خوبصورت پیٹھ پر ہم جیتے ہیں
سکوں تجھ سے ہی صبح و شام لیتے ہیں
اُجالے کی تھکن کے بعد تجھ سے چین لیتے ہیں
مسافر زندگی کے ورق پڑھتے ہیں
تجھے ہی دیکھ کر نظمیں بھی لکھتے ہیں
جواں ہے حسن بڑھنے میں روانی ہے
تری ہر اک کہانی میں کہانی ہے

شاداں رفیق اوڑی
پتہ: گاؤں بلکوٹ، تحصیل اوڑی
ضلع بارہمولہ، جموں و کشمیر
Mob: 8491982514

# نظم

## بنتِ حوا ہوں میرا بس یہی اک جُرم ہے

ڈاکٹر فرزانہ فرحت ۔۔ لندن

سرِ بازار میرا اک تماشا دیکھنے والو
مری آنکھوں میں اشکوں کا یہ دریا دیکھنے والو
مرا زخمی بدن زخمی یہ چہرہ دیکھنے والو
یہ عزت روندنے والو
بدن تک چھیدنے والو
خدا کے قہر سے تم لوگ بھی اب بچ نہ پاؤ گے
کسی کمزور لڑکی پر
بہن پر اور بیٹی پر
جوان کوڑوں کی بارش ہے
سراسر ایک سازش ہے
خدا بننے کی کاوش ہے
تمہاری آزمائش ہے
وہاں کے سارے مردوں نے
مری چیخوں سے آہوں سے
مری ساری کراہوں سے
یہ کیسا لطف پایا ہے
خدا کو آزمایا ہے
نیا مذہب بنایا ہے
مرے زخموں کی شدّت سے
مرے اشکوں کی حدّت سے
فلک تھرّا گیا ہوگا
خدا شرما گیا ہوگا

Dr. Farzana Farhat London
Mob: +447572175363

# غزل

دل لگا کر ہم یہ سمجھے دل لگی کیا چیز ہے
زندگی کیا چیز ہے اور بندگی کیا چیز ہے

دیکھ کر لب کی نزاکت میؔر نے بھی کہہ دیا
نازکی کیا چیز ہے اور پنکھڑی کیا چیز ہے

اس گلی میں چاک ہو میرا گریباں پھر سہی
یہ پتا تو چل سکے کی عاشقی کیا چیز ہے

اک ذرا سی ریت کو ہاتھوں میں پہلے رکھ لیا
پھر گرا کر یہ بتایا زندگی کیا چیز ہے

چھپ گیا ہے چاند جب سے بدلیوں کی اوٹ میں
ہو گیا احساس ہم کو روشنی کیا چیز ہے

واعظوں کو اے ثمؔر کچھ غیرتِ مے اب نہیں
میکشوں سے پوچھتے ہیں میکشی کیا چیز ہے

ثمؔر خالد اعظمی
خداداد پور، سنجر پور اعظم گڑھ

سہ ماہی

حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ

# حاشیہ

اورنگ آباد، مہاراشٹر (انڈیا)

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵ء

# HASHIYA

October to December 2025


Editor : Dr. Hajra Bano

Address: Aurangabad Maharashtra, India